نور شاہ

ایک معمولی آدمی

(افسانے)

ایک معمولی آدمی

افسانے

نور شاہ

14۔لل دید کالونی، غوری پورہ لنک روڈ، راول پورہ، سرینگر 190005، کشمیر

فون:9906771363

نام کتاب : ایک معمولی آدمی

نوعیت : افسانے

مصنف : نور شاہ

بارِ اول : 2017

تعداد : پانچ سو

قیمت : دوسو روپے

کمپیوٹر سیٹنگ : محمد فاروق (9419968112)

طباعت : میزان سروسز

زیر اہتمام : شبیر احمد (9419002212,8494002212,7006773403)

ملنے کا پتہ:
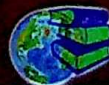
میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بلمقابل فائر سروسز ہیڈ کوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر

انتساب

احمد فرقان شاہ

احمد فواد شاہ

احمد داور شاہ

اور

قاسم کاملی

کے نام

نور شاہ

ترتیب

افسانے ۔ ۔ ۔

اپنی بات

کل شب میں نے سپنا دیکھا جیسے
ایک گہرے گھنیرے جنگل میں
سجی سجیلی
اُوس میں بھیگی ایک تتلی
میرے تعاقب میں گرداں ہو
جیسے
نیم شبی کا سناٹا
ریت کا ساگر
تشنہ لب آوازوں کا ایک گونجتا صحرا
میری جانب دوڑ رہا ہو
شاخ بدن کے سوکھے پتے توڑ رہا ہو ۔ ۔ !!

نور شاہ

بات ایک رات کی

نہ وہ رات اور نہ یہ رات، تو پھر یہ کس رات کی بات ہے جو رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر میرے ذہن کے کینواس پر بکھرے ہوئے رنگوں کو بے رنگ کر رہی ہے اور میری یادوں کے منظر نامے میں پوشیدہ کہانی کو بے منظر کر رہی ہے۔ ہاں میں جس رات کی بات کر رہی ہوں وہ ایک عام سی رات تھی۔ لیکن میرے لئے دوسری راتوں سے ضرور مختلف تھی، بالکل مختلف۔ کار سے اُتر کر لائٹ ہاؤس میں قدم رکھنے سے پہلے میری نظریں اُس پر پڑ گئیں۔ عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا اُس نے اپنے آپ کا۔ لمبے بال، لمبی داڑھی، میلے کچیلے کپڑے۔ مجھے اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ میرے قریب آیا اور بے حد کمزور آواز میں نہایت عاجزی سے کہنے لگا۔ ۔ ۔

''میم صاحب کچھ دیجئے میرے بچوں کے لئے۔ اللہ آپ کی مرادیں پوری کرے گا''

''میری مرادیں'' ۔ ۔ یہ سوچتے ہوئے میں رُک گئی اور پھر کچھ کہے بغیر ہی لائٹ ہاؤس کے اندر چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جانے اور کیا کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہی نا کہ کچھ دیجئے ورنہ میرے بچے بھوکے رہ جائیں گے۔

لائٹ ہاؤس کے اندر نیا ماحول اور نئی فضا دیکھ کر اس کی صورت میری نظروں کے سامنے سے اوجھل ہوگئی۔ رات بھیگتی رہی، کہانی بنتی رہی۔ دوسری صبح جب میں لائٹ ہاؤس کے گیسٹ روم سے نجم سیٹھ کو اکیلا چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے جسم کے ساتھ باہر آئی تو مجھے اچانک احساس ہوا

کہ رات بھر بارش برستی رہی ہے اور ٹھنڈ میں شدت آچکی ہے۔ باہر گیٹ کے قریب کار میری منتظر تھی۔ ڈرائیور نہایت ادب کے ساتھ کار کا دروازہ کھولنے کے لئے تیار نظر آرہا تھا۔ ذرا سی دوری پر وہ ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ میرے قریب آیا۔

''میم صاحب کچھ دیجئے۔ میری مدد کیجئے۔ میں بھیک مانگنے کے لئے مجبور ہوں۔ بیمار ہوں، کام نہیں کر سکتا اور اپنے بچوں کا پیٹ ۔ ۔ ۔ ؟''

''تم۔ تم رات بھر یہاں ۔ ۔ ۔ یہاں رہے؟''

''ہاں میم صاحب ہاں''

''لیکن یہ بارش، ٹھنڈ اور اس قدر سردی''

''ہاں بارش میں بھیگتا رہا۔ بہت ٹھنڈ بھی محسوس ہوئی۔ لیکن میری مجبوری ۔ ۔ ۔ !''

''کیسی مجبوری؟'' ۔ ۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''پیٹ کا معاملہ ہے میم صاحب!'' وہ رونے لگا اور روتے روتے کہنے لگا ۔ ۔

''بیٹی تم بھی تو ۔ ۔ ؟''

''میں ۔ ۔ میں کیا ۔ ۔ ؟''

''تم''

''ہاں ہاں کہو ۔ ۔ ''

''تم بھی تو رات بھر بھیگتی رہی، جاگتی رہی ۔ ۔ صرف ایک پیٹ کی خاطر۔ تمہاری بھی تو کوئی مجبوری ہوگی؟''

اور پھر نجم سیٹھ کی کار میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے خاموشی سے رات بھر کی کمائی کا ایک حصہ اُس کی جھولی میں ڈال دیا ۔ ۔ ۔

تالی

ساس کی بہو سے ناراضگی صرف اس وجہ سے تھی کہ شادی کے چار سال بعد بھی وہ خاندانی وارث کو جنم نہ دے سکی تھی۔ بیوی کو بھی اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ دوا، دُعا اور تعویذ کی مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی جب اس کی اُمید بھر نہ آئی تو اس نے خاموشی اختیار کی اور ساس کے طعنے سننے کی عادت کو اپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیا۔ حاجی نثار علی اپنی وفات کے بعد اپنی بیگم کے لئے کافی جائیدادیں اور اثاثے چھوڑ گئے تھے۔ زمین، زراعت، زر زیور کے علاوہ ایک بڑا سا حویلی نما مکان بھی جو فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ مانا جاتا تھا۔ اتنے بڑے مکان میں رہنے والوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔۔ بیگم نثار علی، بیٹا طارق علی اور بہو صادقہ طارق، گھر کو سنبھالنے کے لئے ایک نوکرانی سارہ۔ طارق علی کو زمین زراعت میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیگم صاحبہ خود ہی دیکھ بھال کرتی آرہی تھیں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی۔ طارق علی نے اپنے لئے ملازمت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ وہ ایک نجی کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ اپنی بیوی صادقہ کو بہت چاہتا تھا لیکن باپ بننے کی تمنا اُس کی سوچوں، اُس کی نس نس میں ایک نشتر بن کر چبھ رہی تھی۔ جب کبھی وہ تنہائی میں اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا، اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا تو ماں کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی۔۔۔

"مکان اور گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے بیٹا۔ مکان تب ہی گھر بنتا ہے جب اُس میں رہنے کا احساس ہو اور یہ احساس تب ہی جاگتا ہے جب بچوں کی آوازیں کانوں میں جینے کا احساس جگاتی ہیں۔ جب اُن کی مسکراہٹوں سے کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں"

اور یہی احساس لئے ماں کے اصرار پر اس نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ لینے کے بعد طارق علی اور صادقہ کی نزدیکیاں دوریوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے جی نہیں رہے تھے، ایک ہی راستے پر چلتے چلتے اُن کی منزلیں بدل چکی تھیں۔ دل کی دولت میں ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔

اور پھر صادقہ نے طلاق لے کر یہ سوچتے ہوئے اپنے والدین کے گھر میں قدم رکھے کہ زندگی جن سے وفا نہیں کرتی وہ موت سے پہلے ہی مرجاتے ہیں!

اور پھر موسم بدلتے رہے، سرما، گرما، بہار، خزاں ۔ ۔ !

صادقہ کی جگہ عارفہ نے لے لی۔ وہ اُس مکان میں آگئی جو فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ مانا جاتا تھا۔ وہ اب اس حویلی نما مکان کو گھر کی شکل وصورت دینے میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

اِدھر والدین کے بے پناہ دباؤ میں آکر صادقہ نے بھی دوسری شادی کرنے کے لئے ہاں کردی!

موسم بدلتے رہے!

اور ایک دن نئے موسم کے آغاز میں صادقہ کو اچانک بابا نرسنگ ہوم میں بیگم نثار علی نظر آئیں۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ صادقہ کی گود میں ایک بچہ تھا اور بیگم نثار علی کے ساتھ کوئی خاتون ۔ ۔ صادقہ کے لئے ایک اجنبی چہرہ؟

"کیسی ہیں آپ ۔ ۔ ؟" ۔ ۔ صادقہ نے پوچھا۔

''یہ ۔ ۔ یہ کون ہے تمہاری گود میں؟'' ۔ ۔ بیگم صاحبہ نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ۔ ۔ یہ میرا بیٹا ہے، گوہر ۔ ۔ گوہرفشاں۔ایک دوروز سے اس کی طبیعت ناساز ہے۔ڈاکٹر سے ملنے آتی ہوں۔اور یہ ۔ ۔ ؟''

''یہ ۔ ۔ یہ میری بہو ہے، بیگم طارق علی''

''لگتا ہے کہ آپ یہاں اپنی بہو کو ڈاکٹری مشورہ کے لئے لاتی ہیں۔آپ خاموش کیوں ہیں ،بیگم نثار علی صاحبہ''

''چلو بہو، دیر ہو رہی ہے'' ۔ ۔ بیگم نثار علی نے صادقہ کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بہو سے کہا۔

''ابھی بہت سارے ٹیسٹ کروانے ہیں۔شام کو پھر ڈاکٹر سے ملنا ہے''

''میری بھی ایک بات سنتے جایئے بیگم صاحبہ!''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میری ایک بات یاد رکھئے گا۔آپ کا مکان ۔ ۔ آپ کا حویلی نما مکان کبھی گھر نہیں بن سکتا''

''کیوں نہیں بن سکتا''

''آپ شاید بھول چکی ہیں کہ تالی بجانے کے لئے ہمیشہ دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بھلا آپ کی بہو ایک ہاتھ سے تالی کیسے بجا سکتی ہے۔آپ کا بیٹا تو تالی بجانے کا اہل نہیں ۔ ۔ ؟ میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ ۔ ۔ بیگم نثار علی صاحبہ ۔ ۔ !!''

☆ ☆

نیلی لوٹ آئے گی

یہ آنکھیں بھی کبھی کبھی ساون کی ندیاں بن جاتی ہیں!

میرے ان آنسوؤں کی کہانی جانے کب شروع ہوئی۔ وہ ایک لوک کتھا ہے نا۔۔۔ ایک تھا چڑا بھولا بھالا سا۔ اُس نے تنکے تنکے جوڑے اور ایک گھر بنایا۔۔۔ گھر بنا تو اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا، اور پھر ایک چڑیا۔۔۔!!

اُس رات جب میں دیر گئے گھر لوٹا تو اپنی خواب گاہ میں ایک چڑا دیکھ کر حیران نہیں ہوا۔ سوچا راہ بھولا ہوگا۔ پو پھٹتے ہی اُڑ جائے گا، فضاؤں میں گم ہو جائے گا۔ میں سو گیا۔۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ کمرے سے چلا گیا تھا، لیکن رات کو پھر اپنی خواب گاہ میں پایا۔ اس نے چند تنکے بھی جمع کئے تھے اور اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں مصروف تھا۔ بڑی محنت، محبت اور سلیقے سے ایک ایک تنکا سنوار رہا تھا۔ کچھ تنکے فرش پر بکھر گئے تھے۔ میں نے فرش سے وہ تنکے جمع کئے اور کھڑکی سے باہر پھینک دیئے اور وہ تنکے بھی جنہیں وہ محبت اور محنت سے جوڑنے میں مصروف تھا۔

چڑے نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا۔ آرزوؤں کی ایک دنیا تھی، ایک گھر کا خواب تھا۔ رات کو کئی بار میری آنکھ کھلی اور ہر بار اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ خاموش خاموش سا وہ شاید اپنا گھر لُٹ جانے سے اُداس ہو گیا تھا۔

جب میرا گھر لُٹ گیا تھا تو میں بھی اُداس ہو گیا تھا۔ اُس وقت کس نے میری آرزوؤں کی دنیا کی پرواہ کی تھی؟ کس نے میرے گھر کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں میری مدد کی تھی؟ نیلی نے بھی نہیں۔ نیلی جو میری اپنی تھی، جس نے میرے ساتھ عمر بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں تھیں۔

میں نے بھی ایک گھر بنانے کا تصور کیا تھا، ایک خوبصورت گھر بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں یادوں کی گنگناہٹ تھی اور ذہن میں زندگی کی منور وسعتیں تھیں۔ میں نے بھی سوچا تھا اپنی زندگی کے بارے میں، اپنی ماں کی آخری حسرت آخری تمنا کے بارے میں، لیکن نیلی تو بڑے گھرانے کی بیٹی تھی اور میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا، محبت میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی، محبت بلندیاں اور پستیاں نہیں دیکھتی۔ بلندیاں اُس کی جانب جھکتی ہیں اور پستیاں اُبھر کر ان بلندیوں کو اپنا لیتی ہیں۔ برسوں سے جلتے ہوئے محبت کے چراغ کو نیلی نے ایک ہی پھونک سے بجھا دیا تھا، ایک گھر لُٹ گیا تھا، ایک دل اُداس ہو گیا تھا۔ ایک خواب اپنی تعبیر کی تلاش میں کھو گیا تھا۔

چڑا اپنا گھر لٹ جانے سے اُداس ہو گیا تو کیا ہوا۔ اب کوئی گھر نہیں بسے گا، اب کسی خواب کی تکمیل نہ ہو گی۔ لٹ جانے دو آرزوؤں کی دنیا کو۔۔۔!

کئی دن ایک ساتھ گزرے۔ مجھے گھر سے باہر رہنا پڑا۔ جب لوٹ آیا تو گھر بن چکا تھا۔ تنکے جوڑے جا چکے تھے اور چڑا اپنے گھر میں چہچہا رہا تھا۔ ایک بار میرے ہاتھ اُس کی جانب بڑھے۔ اس سے پہلے کہ میں اُس کے گھر کے تنکے تنکے بکھیر دیتا، میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہی چھوٹی چھوٹی سی دو معصوم آنکھیں، تمناؤں کی جھیل لئے۔ میرے

ہاتھ رُک گئے۔ میں اپنی اس حرکت پر خود ہی حیران رہ گیا۔

آنسوؤں کی بات تو پھر رہ گئی!

چڑا دولہا بنا اور اپنے لئے ایک چھوٹی سی چڑیا دلہن بنا کے لے آیا۔ دولہا خوش تھا، دلہن خوش تھی۔ دونوں خوشی سے چہچہا رہے تھے۔

گھر بس چکا تھا۔

اور اس لمحے مجھے اپنے گھر کے اندھیرے کا احساس ہوا۔ دل میں ایک آہٹ سی ہوئی۔ دل کا یہ صحرا تو صدیوں سے جل رہا تھا۔ میں نے اپنی پلکوں کو جنبش دی۔ اپنے گھر کے ایک ایک کونے میں گیا۔ ایک ایک شئے کو چھو کر دیکھا۔ ہر سمت ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ ہر شئے سے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تو اپنے ہی گھر میں اجنبی تھا۔

چاندنی کے بغیر چاند بے کیف ہے، بے رنگ ہے!!

چڑیا کے بغیر چڑے کی زندگی ادھوری ہے!!

اور میں ۔ ۔ ۔ میں رو پڑا۔ میری آنکھیں ساون کی ندیاں بن گئیں۔ میں نے نیلی کو تلاش کیا۔ نیلی نہ ملی، اُس کی یادیں اُبھر آئیں۔

نیلی تو کہاں ہے؟

کاش نیلی نے وہ کشمیری لوک کتھا سنی ہوتی ۔ ۔ ۔ !وہی ایک تھا چڑا بھولا بھالا۔ لیکن وہ لوک کتھا تو ابھی ادھوری ہے۔ سنو نیلی۔ پھر دولہے نے دلہن سے کہا ۔ ۔ ۔

”تمہارے کانوں میں یہ بالیاں خوب سجتی ہیں۔ تمہیں کس چیز کی تمنا ہے۔ تم نے تو سات سنگار زیب تن کئے ہیں۔ آؤ میں تمہارے نازک بدن کو سرخ جامہ پہناؤں“

چڑیا مسکرادی اور پھر خود ہی اپنی مسکراہٹ پر شرمائی۔

میں اپنی خواب گاہ سے باہر بالکونی میں نکل آیا۔ مجھے اپنا گھر جہاں میں نے تنہائی کے بے شمار شب و روز گزارے تھے، اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں بھی اندھیرا ہے میرے دل کی طرح۔ ساری بالکونی اندھیرے میں ڈوب چکی ہے۔ اس بالکونی کا میری زندگی اور میری تنہائیوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس نے کئی چاندنی راتوں میں مجھے جینے کی تحریک بخشی ہے۔ کئی طوفانی اور تاریک راتوں میں پناہ دی ہے۔ جیسے آج کی رات ۔ ۔ ۔ میں تنہا ہوں۔ نیلی نہ جانے کہاں ہے۔ ہاں گلی کے اُس پار والے مکان کی بالائی کھڑکی ابھی بند نہیں ہوئی ہے۔ بجلی کی دھیمی دھیمی سی روشنی اب بھی کھڑکی سے باہر آرہی ہے۔

آنسو اب تھم چکے ہیں۔

پریتی کا آدھا چہرہ نظر آرہا ہے۔ یہ پریتی بھی عجیب لڑکی ہے۔ ساری رات جانے کیا پڑھتی رہتی ہے۔ میں نے تو اُسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، لیکن ہے بہت سندر، اُس کا سراپا رومان انگیز ہے۔ آنکھیں تو آبِ حیات کا چشمہ ہیں۔ زلفیں ہیں کہ ان میں اُلجھنے کو جی چاہتا ہے اور اس تاریکی میں سیب کے شگوفوں کی جو مہک محسوس ہو رہی ہے وہ ضرور اس کی سانسوں سے تعلق رکھتی ہوگی۔

یہ نیلی کہاں چلی گئی۔ اس سے ملے مدتیں گزر گئیں۔ پریتی سامنے ہے۔ اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے تو میں اب اُکتا چکا ہوں۔

۔ ۔ ۔ صرف چہرہ دیکھنے سے من کی پیاس بجھتی ہے؟

اور اگر میں ایک چڑا ہوتا۔

ہاں اگر میں واقعی ایک چڑا ہوتا تو تنکے جمع کرتا، اپنا ایک آشیاں بناتا ۔ ۔ ۔ اور مجھے نیلی

ملتی۔ اب یقین نہیں آتا کہ وہ کبھی ملی تھی۔ اس پگڈنڈی کے نشان دُھندلا گئے ہیں جس پر سے گزر کر وہ آئی تھی اور میرے دل کے آشیانے میں دونوں پر پھیلا کر صرف ایک لمحے کے لئے بیٹھ گئی تھی۔ یہ چڑیا بھی اس وقت ایسے ہی بیٹھی ہے اور چڑا۔ اُس بے چارے کو اس لمحے کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ اس آواز کے بارے میں بھی کوئی جانکاری نہیں جو گلی کے نیم اندھیروں سے اُبھرتی ہے اور ایک سائے کی طرح میرے وجود کو چھوتی ہوئی جانے کس جانب نکل جاتی ہے۔ اس آواز کا تعلق کیا مجھ سے ہے یا اس گھونسلے سے جہاں اس وقت یہ چڑیا بیٹھی ہے۔ جب یہ آواز آتی ہے تو لگتا ہے جیسے پگھلی ہوئی چاندی بہہ رہی ہو۔ اس آواز میں تو نگین کی گل پوش جھیل کا سا سکون ہے۔ یہ آواز کانوں سے ٹکراتی ہے تو ۔ ۔ ۔ ؟

''کون ۔ ۔ ؟''

نیلی ہوگی۔ لیکن نیلی تو یہاں نہیں ہے۔ نیلی کا وجود نہ سہی لیکن یادیں تو ہیں ۔ ۔ ۔ یادوں کے سہارے ہی کیا گھر بسانے کے خواب کی تعبیر مل سکتی ہے۔ خواب کی تعبیر کے لئے تو تنکے جمع کرنے پڑتے ہیں جیسے چڑے نے کیا ۔ ۔ اور پریتی ۔ ۔ کھڑکی بند ہو چکی ہے۔ چہرہ نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ نیلی نہیں ہے، پریتی نہیں ہے۔ وہ آواز بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

نیلی سے پہلی ملاقات کی بھینی بھینی خوشبو اب بھی میری سانسوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ سامنے تو رہتے تھے وہ لوگ ۔ ۔ ۔

لیکن یہ یہاں کی بات نہیں۔ تب میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا ایک چھوٹے سے مکان میں۔ اُس چھوٹے سے مکان کے ساتھ ہی ایک اچھی خاصی کوٹھی تھی۔ جانے کب سے خالی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ پھر معلوم پڑا، کوٹھی بک

چکی ہے۔ کسی کپور صاحب نے خریدی ہے۔ وہ خود جرمنی میں تھے۔ اُن کی بیوی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس کوٹھی میں رہنے کے لئے چلی آئی تھی۔ میں نے کوئی بھوت پریت نہیں دیکھا۔ البتہ ایک پری دیکھی، ایک خوب صورت پری، جیسے وہ برفیلے پہاڑوں سے اُتر کر یہاں آ گئی ہو۔ اُجلی اُجلی ۔ ۔ دُھلی دُھلی سی ۔ ۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اچانک وہ جاگ پڑی جیسے کوئی سپنا دیکھ کر جاگ پڑتا ہے۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی، میری طرف دیکھا اور پھر ۔ ۔ ۔ !

کھڑکی بند ہو گئی۔

چاند پہلی بار چمکا تھا۔ چاندنی پہلی بار تھرکی تھی۔

ایک رات میری ماں بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر کے پاس جاتا تو ماں کے پاس کون رہتا۔ عجیب پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ ماں کی نیم مردہ آواز سنائی دی ۔ ۔ ۔

''بیٹا سامنے والی کوٹھی میں ڈاکٹر نینا رہتی ہے۔ لیکن سب اُسے پیار سے نیلی کہتے ہیں''

یہ ڈاکٹر نینا کون ہے ۔ ۔ ؟

درواز کھلا اور ڈاکٹر نینا باہر آئی ۔ ۔ ۔ برفیلے پہاڑوں کی اُجلی اُجلی ۔ ۔ ۔ دُھلی دُھلی سی پری نے ڈاکٹر نینا کا روپ اپنا لیا تھا۔

''میری ماں بیمار ہے''

''چلئے میں دیکھتی ہوں'' ۔ ۔ مجھے لگا جیسے پگھلی ہوئی چاندنی بہہ گئی ہو۔

اس کے بعد وہ کئی بار ہمارے ہاں آئی۔ میں اُن کے ہاں گیا۔ آہستہ آہستہ ہماری یہ جان پہچان، ہماری یہ ملاقاتیں قربت میں بدل گئیں۔ ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئیں اور محبت کا ایک اَن دیکھا چراغ جلا۔ پیار کا ایک ساغر وجود میں آیا۔

رات بھیگ چکی ہے۔ اب سونا چاہیے۔ یہ نیند کی دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں ۔ ۔ ۔ مجھے تیرے بغیر نیند نہیں آتی۔

وقت گزرتا رہا۔

محبت کا چراغ جلتا رہا۔

''نیلی، ماں بیمار رہتی ہے۔ اُس کی آخری تمنا، اُس کی آخری خواہش ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔''

''کیا چاہتی ہے؟''

''اپنی بہو کا منہ دیکھنا چاہتی ہے''

''تو کر لو نا شادی''

''نیلی تم''

''کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے؟''

''ہاں ہے۔ اُجلی اُجلی سی''

نیلی کی آنکھیں مسکرائیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ مسکراہٹ دب گئی۔ ایک ہی پھونک سے محبت کا چراغ بجھ گیا۔ ایک ہی سانس میں ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

''میں نے شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں''

''لیکن محبت ۔ ۔ وعدے''

''محبت اپنی جگہ ہے۔ لیکن شادی میں اُس کے ساتھ ہی کروں گی جس کے پاس ایک خوبصورت گھر ہوگا''

''گھر تو میرے پاس بھی ہے''

''یہ گھر وہ گھر نہیں ۔ ۔ ۔ گھر سے میرا مطلب ایک شاندار کوٹھی، ایک خوبصورت زندگی

ہے۔ جانتے ہو کہ زندگی کی خوبصورتی کسے کہتے ہیں، کیا ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ نہیں، نہ تم جانتے ہو اور نہ ہی سمجھ سکتے ہو''

ماں اپنی آخری حسرت آخری تمنا لے کر چلی گئی ۔ ۔ ۔ !

میں نے گھر چھوڑ دیا ۔ ۔ ۔ شہر چھوڑ دیا۔

چڑے نے تنکے تنکے جوڑے۔ گھر بنا لیا۔ میں نے روپیہ روپیہ جوڑا اور ایک کوٹھی خریدی۔ زندگی کی بہت ساری خوب صورتیاں خریدیں۔ بستی بستی، شہر شہر گھوما لیکن نیلی نہ ملی۔ میرا گھر لُٹ گیا۔ میرے خواب بکھر گئے۔

میں اب نیلی کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ چڑا اپنی چڑیا کو لے کر آ گیا اور میرے ماضی کے دھندلکوں سے بہت ساری یادیں اُبھر آئیں ۔ ۔ ۔ اور پریتی ۔ ۔ ۔ صبح کی پہلی کرن کی طرح خوبصورت، سندر ۔ ۔ ۔ ابھی ابھی یہاں آئی تھی ۔ ۔ ۔ میرے قریب ۔ ۔ ۔

''دیکھئے آپ کے ہاں ہماری ایلسیشن تو نہیں آئی ۔ ۔ ۔ ؟''

''ایلسیشن ۔ ۔ ۔ ایلسیشن یہاں کیا لینے آئے گی۔ ہاں ایک پری ضرور اُتر آئی ہے'' ۔ ۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پریتی شرما گئی۔

''اندر نہیں آؤ گی ۔ ۔ ؟'' میں نے یوں ہی کہا۔

وہ اندر آ گئی ۔ ۔ ۔ میں پریتی کو دیکھنے لگا، ایک نئے زاویئے سے، ایک نئی نظر سے ۔ ۔ اوپر اپنے گھونسلے میں بیٹھی چڑیا دیکھ رہی تھی۔ شاید کہہ رہی تھی ۔ ۔ ۔

''لاؤ اسے اپنے گھر میں ۔ ۔ یہ تمہارا گھونسلا سجائے گی۔ تمہاری تنہائیوں میں رنگ

بھر دے گی ۔ ۔ ۔ نیلی کیا اس سے زیادہ خوبصورت تھی ۔اس کی آنکھوں میں جھانکو، یہ تم کو چاہنے لگی ہے۔ پیار کرنے لگی ہے ۔ ۔ ۔ اس کے مکان کی کھڑکی صرف تمہارے لئے کھلی رہتی ہے! مجھے لگا جیسے چڑا چڑیا کی باتیں سن کر خوش ہو رہا تھا۔

''پریتی ۔ ۔ ۔ پریتی ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''

''میں ۔ ۔ ۔ میں بھی آپ سے کچھ سننے کے لئے ہی آئی ہوں''

''کیا ۔ ۔ ؟''

''جو آپ سوچ رہے ہیں''

دفعتاً نہ جانے کیا ہوا ۔ ۔ ۔ میرے اندر ۔ ۔ میرے وجود کے اندر ایک طوفان بپا ہوا ۔ ۔ !

''نکل جاؤ یہاں سے ۔ ۔ ۔ یہ تو ۔ ۔ ۔ میرا ۔ ۔ ۔ یہ گھر نیلی کا ہے اور اُس کے آنے تک ویران رہے گا''

پریتی بھونچکا رہ گئی۔ حیران و پریشان نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ چڑیا اپنے چڑے کے اور قریب سرک آئی ہے۔اب دونوں مل کر شور مچانے لگے ہیں ۔ ۔ ۔ !

جی چاہتا ہے کہ ان کا گھونسلا اُجاڑ دوں۔ لیکن یہ سوچ کر خاموش ہوتا ہوں کہ شاید نیلی لوٹ آئے گی ۔ ۔ ۔ !!

☆ ☆

اپنی اپنی کہانی

محبت کی بہت ساری قندیلیں جلانے کے بعد اُن دونوں نے جیسے ایک جان دو قالب کا روپ دھار لیا۔ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہونے کے بعد اُنہیں لگا جیسے جو کچھ بھی ہے، اُن کے قریب ہے اور اُن سے دور کچھ بھی نہیں۔ شاید اس قربت سے پہلے اُن دونوں کی نگاہوں میں آگ کے تیز و تند شعلے لپک رہے تھے، لیکن اب ان نگاہوں میں سکون تھا۔ تیز و تند شعلے لپک لپک کر جیسے تھک چکے تھے، تھم چکے تھے۔

اُن کی ملاقات بھی ایک فلمی انداز میں ہوئی تھی۔ آنند اپنے آفس سے باہر آ کر اپنی کار کی جانب بڑھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں ۔ ۔ ؟''

آج شاید مدتوں بعد، نہیں شاید پہلی بار مٹھاس سے بھرپور ایک آواز اس کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی اور اسے لگا تھا جیسے قطرہ قطرہ شہد اس کے کانوں میں انڈیلا جا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ایک خوبصورت سی جوان بے باک سی لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی ۔ ۔

''Oh Sure کہاں جانا ہے آپ کو؟''

کہاں جانا کا ذکر کئے بغیر وہ کار میں بیٹھ گئی۔ اپنی کار اسٹارٹ کرتے ہوئے آنند کو محسوس ہوا جیسے اس کی خشک سی تھکی تھی سی زندگی میں اُجالے کی ایک کرن جانے کہاں سے اور کیسے

پھوٹ پڑی ہے۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چیف اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور پیشے کے تعلق سے وہ ایک اچھی خاصی سیلری لیتا تھا۔ بالائی آمدنی کے بہت سارے ذرائع بھی میسر تھے۔ روپے پیسے اس کی زندگی کی بہت ساری مرادیں تو پوری کر سکتا تھا کیونکہ روپے پیسے سے ہی عمارتیں تو خریدی جاسکتی ہیں لیکن محبت کی چاشنی کہیں نہیں ملتی۔ محبت اگر بازار میں ملتی تو خریدی جاسکتی تھی۔ شاید خشک خشک سی زندگی گزارتے ہوئے آنند کو لگ رہا تھا جیسے اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے خاموش خاموش لمحے ایک خوبصورت سی جوان سی لڑکی کے سراپا میں ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو گئے ہوں۔

''میں آنند ہوں''

''اور میں الکا''

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ کار چلتی رہی۔

''ذرا رُکیۓ گا''۔۔ الکا نے کہا۔

آنند نے زور سے بریک لگا کر کار روک دی۔

''آپ میرے ساتھ کافی پینا پسند کریں گے۔ سامنے جو ریسٹوراں نظر آرہا ہے، وہاں بہت اچھی کافی ملتی ہے''

''جی ہاں، جی ہاں''۔۔ آنند نے گھبراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

جانے کیسے آنند کا ہاتھ الکا کے ہاتھ سے چھو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں تشنگی تھی، پیاس تھی اور پیاس بے نام تھی۔ شاید محبت بھی بے نام ہی ہوتی ہے۔

پورے تین ماہ وہ ایک دوسرے کے پیار میں ڈوبے رہے۔ آنند کی بالائی آمدنی کا کچھ حصہ

رات اور خواب کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتا رہا اور پھر اپنی محبت کو ابدیت دینے کے لئے آنند نے الکا کے سامنے شادی کرنے کی تجویز سامنے رکھی۔ لیکن الکا نے شادی کے بندھن میں بندھنے سے پہلے بنگلور کی مشینی زندگی سے دور کسی سیاحتی مقام پر چند دن گزارنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ آنند کو الکا کی تجویز پسند آئی۔

کشمیر کی خوبصورت دھرتی پر قدم رکھتے ہی آنند کو لگا جیسے اس نے بہت قریب سے جنت دیکھ لی ہو۔

''تم پہلے بھی کشمیر ہو آئی ہو ۔ ۔ ؟''

''میں ۔ ۔ میں ۔ ۔ نہیں تو ۔ ۔'' الکا نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دراصل میں بہت پہلے کشمیر آئی تھی، اپنے ڈیڈ کے ساتھ ۔ ۔ ہاں اُس وقت ڈل جھیل نہ دیکھ سکی۔ بہت تعریف سنی ہے اس جھیل کی''

''تو اب دیکھ لیتے ہیں۔ جی بھر کر دیکھ لیتے ہیں۔ ڈل کے کنارے کسی ہوٹل میں قیام کریں گے''

ڈل کے کنارے بلیوارڈ پر ان کی ٹیکسی دوڑتی رہی۔ ایک جگہ الکا نے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کیا۔

''سنو بھیا سامنے والے ہوٹل میں ڈراپ کرو''

ہوٹل کے لان میں ٹیکسی رُکی۔ وہ دونوں باہر آئے۔ آنند نے دائیں بائیں دیکھا۔ اِدھر اُدھر اپنی نظریں گھمائیں۔ ہر جانب دل لبھانے والا منظر تھا۔ یہ مناظر دیکھ کر اس کے دل میں ایک عجیب سی بے قراری کا احساس ہوا۔ ایک انجانی تمنا دل کے گوشوں میں دھڑکنے لگی۔ اس نے الکا کی جانب دیکھا۔ الکا سے ملنے سے پہلے اس کی زندگی کس قدر اُجاڑ اُجاڑ تھی،

ویران ویران تھی، اور اب الکا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔ ہوٹل کے اندر نہیں چلو گے'' ۔ ۔ الکا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں''

وہ دونوں کاؤنٹر پر آ گئے۔

منیجر نے ویٹر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

''ان کا سامان روم نمبر 103 میں رکھ آؤ اور اس نے آنند اور الکا کی جانب بغور دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

''یور نیم پلیز''

''آنند ملہوترہ۔ ہم لوگ بنگلور سے آئے ہیں۔ یہ رہا میرا وزیٹنگ کارڈ''

''رائٹ سر۔ دراصل ہمیں ہوٹل میں آنے جانے والوں کے بارے میں ساری جانکاری حاصل کرنا پڑتی ہے''

''That is good۔ میرا نام تو آپ نے پوچھ ہی لیا۔ ان کا نام آپ نہیں جاننا چاہیں گے؟''

''جی ہاں ضرور جاننا چاہوں گا، پر ۔ ۔ ۔ ''

''پر کیا''

''سر جانے بھی دیجئے''

''پھر بھی مسٹر منیجر'' ۔ ۔ آنند نے ذرا اونچے لہجے میں پوچھا۔

''ان کا نام ۔ ۔ ۔ ان کا نام ہم جانتے ہیں۔ ان کو بھی جانتے ہیں''

''وہ کیسے ۔ ۔ ؟'' آنند کے لہجے میں اب ناراضگی کا عنصر شامل تھا۔

’’سر یہ ہمارے ہاں ۔ ۔ میرا مطلب ہے کہ ہم انہیں دو تین سالوں سے جانتے ہیں۔ میڈم سال میں دو ایک بار ہمارے ہوٹل میں قیام کرنے کی غرض سے آتی ہیں‘‘

’’الکا اور یہاں کشمیر میں ۔ ۔ اس ہوٹل میں ۔ ۔ What are you talking‘‘

’’جی ہاں۔ سال میں دو ایک بار اور ہر بار ایک نئے مرد کے ساتھ، میرا مطلب ہے نیا ساتھی، نیا دوست۔ سر ہم ان کے نام اور ان کے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ سر آپ جایئے نا اپنے کمرے میں۔ میں نے جو کمرہ آپ کے لئے رکھا ہے، وہ میڈم کو بہت پسند ہے۔ یہاں سے قریب قریب سارا ڈل نظر آتا ہے، Sir, you will enjoy staying in this room‘‘

الکا اور آنند خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ شاید دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔

شاخِ بے ثمر

بچپن، لڑکپن اور جوانی کی نزدیکیاں ایسی صورت حال اختیار کر جائیں گی، کسی نے سوچا بھی نہ تھا، اُن کے گھر والوں نے اور نہ ہی اپنوں اور غیروں نے۔ لیکن وہ دونوں سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے پر بضد تھیں۔ سارا اور عارفہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ جو کچھ کرنے جارہی ہیں وہ اخلاقی اور مذہبی طور پر ہرگز ہرگز درست نہیں۔ قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشرہ اور سماج بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور یہ رشتہ ہر حالت میں شاخ بے ثمر ہی ثابت ہوگا۔ لیکن ان دونوں کا فیصلہ اٹل تھا۔ ان کا یہ جنون انہیں اس قدر اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اور ان کے ذہن اور دل پر چھا گیا تھا کہ انہیں کسی بھی نوعیت کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے گھر میں اپنے شہر میں دو سہیلیوں کا میاں بیوی کے روپ میں رہنا ممکن نہیں دکھائی دے رہا تھا، اس لئے ان دونوں نے اپنے شہر سے بہت دور ایک نئے شہر میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس شہر میں نہ تو کوئی ان کو جانتا تھا اور نہ ہی اِن کے اس رشتے سے واقف تھا۔ البتہ وہ اپنے شہر سے اپنے گھریلو ملازم کو اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ وہ بھی اس رشتے کی پیچیدگیوں سے ناواقف تھا۔ یہ رشتہ، یہ نزدیکی اور اس قدر اپنا پن اس کی سوچ اور اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ گھر کے کام کاج کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی اور اس تعلق سے سارا اور عارفہ کو کسی دقت کا سامنا نہیں

کرنا پڑ رہا تھا، نہ گھر کے اندر اور نہ ہی گھر کے باہر!

وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا۔ ان کی محبت کی قندیلیں جلتی رہیں۔ لیکن ایک روز قریب قریب چھ ماہ بعد ان دونوں کو اپنے اندر اپنے وجود میں ایک نئی تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ اپنی ان نئی نئی جسمانی تبدیلیوں سے آشنا ہونے کے لئے انہوں نے ڈاکٹر سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا اور پھر ہنستے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

''مبارک ہو آپ دونوں ماں بننے والی ہیں''

''ماں ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ سارا اور عارفہ نے حیران حیران نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''جی ہاں! آپ گھبرا کیوں رہی ہیں۔ آپ کے وہ کہاں ہیں، وہ ساتھ نہیں آئے کیا؟''

''تو کیا سارا نے بھی میری طرح'' ۔ ۔ عارفہ کے ذہن میں سوال اُبھرا۔

''تو کیا عارفہ نے بھی میری طرح'' ۔ ۔ سارا کے ذہن میں بھی سوال اُبھرا۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں'' ۔ ۔ ڈاکٹر کی آواز سن کر وہ ایک لمحے کے لئے چونک گئیں اور بے اعتبار نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگ گئیں!

اور ڈاکٹرس روم سے ذرا دور ان دونوں کا گھریلو ملازم ایک ساتھ دو بچوں کا باپ بننے پر مسکرا رہا تھا!!

ماں نہیں روئی

رات اُترنے سے ذرا پہلے بندوقوں کی گن گرج بند ہوگئی اور پھر رات آہستہ آہستہ خاموشی کے کالے سایوں میں سمٹنے لگی۔ لگ رہا تھا جیسے ہواؤں نے جھومنا بند کردیا ہو۔ زندگی کی نبض ہمیشہ کے لئے رُک گئی ہو۔ لیکن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ایک بار پھر گولیوں کی گن گرج سے زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ خوف و وحشت نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لگتا تھا جیسے خوابوں کے سرسبز شاداب جنگل، صحراؤں میں بدل گئے ہوں اور پھر دیکھتے دیکھتے ایک کہرام سا مچ گیا۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے اور وہ مکان جس میں وہ تنِ تنہا زندگی کے تمام ذائقے ایک ہی بار ایک ہی ساتھ اپنے وجود میں دفن کر چکا تھا جل جل کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہونے لگا اور وہ جانے انجانے لوگ اپنی اپنی بندوقوں سے اُگلنے والی آگ سے پوری بستی کو خاک و خون میں ڈبو کر وہاں سے چل دیئے۔ بستی کے لوگ۔۔ مرد و زن، بچے بوڑھے اپنے اپنے گھروں سے باہر آئے۔ جلتے بجھتے مکان کے ایک کمرے میں وہ مردہ پڑا تھا۔ بے بسی اور بے حالی کے درد بھرے لمحوں میں اب جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں وہ رونے کی تھیں۔ سب رو رہے تھے اور جو نہیں رو رہی تھی وہ اس کی ماں تھی۔

میت جلتے بجھتے مکان کے آنگن میں رکھی گئی تا کہ لوگ آخری بار اُسے دیکھ سکیں۔ اب بہت

سارے رشتہ دار، دوست واحباب اور ہمسایہ بھی آنگن میں نظر آرہے تھے اور سب رورہے تھے، زورزور سے رورہے تھے اور جواب بھی نہیں رورہی تھی وہ اُس کی ماں تھی!!

اپنے لختِ جگر کا چہرہ آخری بار دیکھنے کے بعد بھی ماں نہیں روئی، بالکل نہیں روئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔

اور جب میت کو غسل دینے کی نوبت آئی، تو لوگوں کا عظیم اجتماع دیکھ کر ہواؤں نے اپنا رُخ بدل دیا۔ ہر جانب درد وکرب میں ڈوبی ہوئی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اس اجتماع میں اُس کی ماں بھی شامل تھی لیکن وہ اب بھی نہیں رورہی تھی!

''تمہارا بیٹا نہیں رہا اس دنیا میں اور تم خاموش ہو!''

''تمہاری کائنات مٹ چکی ہے اور تم خاموش ہو!''

''تمہارا اکلوتا کماؤ بیٹا تمہیں اکیلا تنہا چھوڑ کر جارہا ہے اور تم خاموش ہو!''

جوان بیٹے کا تابوت گھر سے نکلا تب بھی ماں نہیں روئی۔ دفنانے کے بعد جب اپنے پرائے لوٹ کر آئے تو انہوں نے دیکھا ماں اب بھی خاموش ہے۔ اب بھی اُس کی آنکھوں میں کوئی نمی نہیں ہے۔

''کیسی ماں ہے یہ ۔ ۔ ؟''

لمحے آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے، اور پھر وہ دن بھی آیا جب ماں سے ایک مجلس میں شرکت کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس کے حق میں معاوضے کے طور پر ایک موٹی رقم منظور کی گئی تھی۔ اس مجلس میں شرکت کرنے کی غرض سے ماں اپنی رضامندی دے چکی تھی ۔ ۔ آخر رقم

بھی اچھی خاصی تھی ۔ ۔ دل لُبھانے والی ۔ ۔ پانچ لاکھ۔

"کیسی ماں ہے یہ ۔ ۔ ؟"

ایسا نہیں ہوسکتا؟ کوئی ماں ایسا نہیں کرسکتی؟ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی؟ لیکن وہ تو جانے کے لئے تیار تھی ۔ ۔ !

اور جب سجی سجائی مجلس میں معاوضے کی رقم لینے کے لئے اس کا نام لیا گیا وہ لوگوں کے اجتماع سے نکل کر سٹیج کی جانب چل پڑی۔ لوگوں کو اس کی سخت دلی پر حیرانی ہوئی اور تعجب بھی۔ ناراضگی ہوئی اور پریشانی بھی، ندامت ہوئی اور شرمندگی کا احساس بھی ۔ ۔ یہ تو ان کی ہار تھی، مقصد و مدعا کی شکست تھی، اور سب سے اہم اور بڑی بات ۔ ۔ یہ تو ماں کی عظمت پر دھبہ تھا۔ انسانی خون کی بے حرمتی تھی!

ایک لفافہ پیش کیا گیا۔ ماں نے لفافہ ہاتھ میں لیا اور پرسکون انداز میں کھول بھی دیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں ایک چیک تھا ۔ ۔ پانچ لاکھ کا چیک ۔ ۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ ہلا ہلا کر چیک کی نمائش کرنے لگی!

اب کیا ہوگا؟

انسانی رشتوں کی عظمت کا کیا ہوگا؟

ایک معصوم، بے گناہ اور بے قصور بیٹے کے قطرہ قطرہ، بوند بوند لہو کی سرراہ نیلامی کے بعد کیا ہوگا؟

ان گنت آنکھیں اسٹیج کی جانب دیکھے جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے قراری تھی، تجسس تھا اور غیر یقینیت کا احساس بھی صاف صاف جھلک رہا تھا۔

اچانک اس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اس کے جسم کا سارا خون، بوند بوند خون اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ چیک کو ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہوا میں اُچھال دیا اور خونخوار نظروں سے چیک پیش کرنے والے کی جانب دیکھا، دیکھتی ہی رہی اور پھر اپنی پوری قوت سے اُس کے منہ پر تھوک کر اسٹیج سے نیچے چلی آئی۔ ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کے صحرا میں صرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی ۔ ۔ ۔

"نہیں میں ماں ہوں ماں اور میں اپنے بیٹے کے خون کی نیلامی نہیں ہونے دوں گی ۔ ۔ کبھی نہیں ۔ ۔ !"

یہ کہنے کے بعد بھی ماں نہیں روئی، بالکل نہیں روئی ۔ ۔ !

بے نام کہانی کا آخری ورق

اپنے شہر کی کہانی تو ہم صدیوں سے سنتے آئے ہیں، پڑھتے آئے ہیں اور لکھتے بھی آئے ہیں۔ لیکن آج اس کہانی کا ایک نیا رُخ ایک نیا پہلو نئے انداز کے ساتھ میرے ذہن میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ میری سوچوں میں بدلاؤ لا رہا ہے۔ شاید اسی لئے میں اپنے آپ کو اپنے وجود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کر کے خاموشی کے جنگل میں گم ہونا چاہتا ہوں تا کہ کچھ بھی نہ دیکھ سکوں، کچھ بھی نہ سن سکوں، کچھ بھی نہ پڑھ سکوں ۔ ۔ ۔ پھر سوچتا ہوں بھلا آنکھیں بند کرنے سے کیا دل کی روشنی بجھ سکتی ہے؟

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں چل پھر کر بھی ہم منزل کو چھو نہیں سکتے اور کبھی منزل خود ہی سفر طے کر کے آواز دیتی ہے!

آج کی کہانی کا تعلق نہ تو اس شہر کی رنگا رنگی اور خوبصورتی سے ہے اور نہ ہی سپیدے کے قطاروں میں بکھرے ہوئے راستوں سے ہے۔ نہ تو پہاڑوں کے دامن میں بل کھاتے ہوئے چشموں کے یخ ٹھنڈے پانی سے ہے اور نہ ہی رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکے ہوئے مرغزاروں میں اس کہانی کا پس منظر چھپا ہوا ہے۔ البتہ شہر کی کہانی کا یہ ورق ۔ ۔ آج کا یہ نیا ورق بڑا ہی معلوماتی ہے اور میں بڑی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ ان معلومات کی تہہ میں اُترنا چاہتا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ ایک مختصر سی اخباری خبر نے مجھے اس قدر بے چین

کیوں کرر کھا ہے اور یہ خبر کیوں میرا سکون چھینے جارہی ہے ۔ ۔ ۔ !

اس شہر کی کہانی میں کتوں کو کیوں اتنی اہمیت دی جارہی ہے؟

ایک اخباری خبر کے مطابق ہمارے شہر میں کتوں کی مجموعی تعداد میں بیس فیصد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ چند برس قبل ان کتوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔ پھر سیلاب نے ایک بھرپور تباہی مچادی۔ کتے بھی انسانوں کی طرح سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچ نہ سکے۔ سیلاب میں مرنے والے کتوں کی تعداد پانچ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے اور اس کے بعد کچھ کتے اپنی موت آپ مر گئے اور کچھ سرکاری زہر کھا پی کر ابدی نیند سو گئے۔ اب جو کتے زندہ ہیں، سلامت ہیں اور شہر میں جہاں کہیں بھی گھوم پھر رہے ہیں سرکار اِن کو ٹھکانے لگانے کے لئے ایک نئے پروجیکٹ پر کام کر رہی ہے۔ اعداد و شمار اکٹھا کئے جارہے ہیں اور عنقریب ہی ایک منصوبہ بند طریقے سے اس پروجیکٹ کو عملی صورت دی جارہی ہے اور اس طرح کتوں کی تعداد میں کمی آنے سے انسانوں کو تحفظ حاصل ہوگا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ تحفظ دینے کی یہ کہانی کب اور کس موڑ پر سمٹ کر رہ جائے گی اور کن اوراق میں گم ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ میرا کیا؟ ان کتوں سے میرا کیا واسطہ، کیا تعلق اور اخباری خبر میں اس قدر دلچسپی کیوں؟ لیکن کچھ تو ہے ضرور۔ کچھ ہے شاید اسی لئے پریشانیوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ میرے ذہنی تناؤ نے میری سوچوں کو بے حس کر دیا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں سکتا۔ میں سوچنے کی سکت رکھتے ہوئے بھی بول نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ اس خبر کہ تہہ میں، میں شاید انسانی وجود کو لرزتے لڑھکتے دیکھ رہا ہوں۔ پرانے نئے مکانوں میں اُداسی کا بسیرا دیکھ رہا ہوں۔ سہمے ہوئے مکین دیکھ رہا ہوں۔ رفاقتوں اور محبتوں سے دور ہوتی ہوئی زندگی دیکھ رہا ہوں ۔ زمین کی کھردری چادر پر سمٹی ہوئی انسانی زندگی کو اپنی بقا کے لئے

لڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ۔ ۔ ہاں یہ سچ ہے اور میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس خبر کی تہہ میں مجھے گولہ بارود کی بو کا احساس ہو رہا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں، لہو ہی لہو نظر آ رہا ہے۔ بینائی سے محروم کھلی کھلی آنکھیں نظر آ رہی ہیں ۔ ۔ ۔ یہ میں کیسی آگ دیکھ رہا ہوں جو برہنہ ہو کر محوِ رقص ہے اور گلشن گلشن میرے شہر کے ہر ہر لمحے میں کرب ناک وحشت طاری کرنے میں مصروف ہے۔ میرے دریائے جہلم کی روانی اب کس کہانی کو دہرانے جا رہی ہے۔ میرے ڈل جھیل کے کنول کیوں مرجھا رہے ہیں۔ میرے پری محل کی پریاں نغمے گاتے گاتے کیوں خاموش ہو گئی ہیں!

جانے ہمارے سہانے اور سنہرے خواب ہمیں کیوں ڈسنے لگے ہیں!

کتوں کی خبر تو ایک اخباری خبر تھی۔ خبروں کا کیا ہے۔ خبر پڑھ لی اور اخبار بے معنی ہو گیا، لیکن جو خبر میرے ذہن میں آہستہ آہستہ رُک رُک کر راستہ بنا رہی ہے، میری سوچوں کو ہموار کر رہی ہے، دُعا کرتا ہوں کہ وہ سچائی کا روپ اپنا کر کسی اخبار کی زینت نہ بنے۔ اسی لئے اپنی بات کہتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے، کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ زرد پتوں کے زرد موسم میں یا سپید موسم کے برفانی تودوں میں سب کچھ ایک جیسا دکھائی دیتا ہے ۔ ۔ ۔ یک رنگی ۔ ۔ ۔ کتے اور انسان بھی!!

بے موسم بادل

یہ میری جھیل ہے ۔ ۔ ڈل جھیل۔ برف پوش پہاڑوں کی گود میں اپنی وسعتیں لئے اوراس کی سیمیں سطح پر سرکتے ہوئے کنول کے پھول اوران پھولوں کے پتوں پر بکھرتے ہوئے پانی کے لرزاں قطرے۔ ان قطروں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے اس انجانے دیش کے اَن دیکھے شہزادے نے زمرد کے کچے موتی پکنے کے لئے رکھ دئے ہوں۔ انجانے دیش کا وہ شہزادہ جو اسی جھیل کے کنارے کسی ایک چنار کے سائے میں پوشیدہ ایک قبر میں کچے موتیوں کے پکنے کے انتظار میں صدیوں سے سویا پڑا ہے۔ میرا ڈل جھیل پریوں کا گھوارہ ہے۔ چاندنی راتوں میں جانے کس کی تلاش میں آج بھی انہیں گھومتے پھرتے پاتا ہوں۔ چاند کی زرد کرنیں جب ڈل کی نیلی پیلی سبک لہروں کا گھونگھٹ اُٹھاتی ہیں تو مجھے یہ جل پریاں بے قرار، بے کل، دردوغم کے گیت الاپتی نظر آتی ہیں۔

میرے لئے ایسی قبر بنانا

جہاں برف ہو

جہاں ہر سال برف گرے

تمام عمر آگ کی جلن میں تڑپتا رہا

موت کے بعد

برف کی قبر میں سکون سے سو جانا چاہتا ہوں

جانے یہ گیت کس کے لئے ہیں ۔ ۔ ۔

شکستہ قبر میں لیٹے ہوئے اس شہزادے کے لئے یا میرے لئے، میں بھی تو ساری عمر ایک عجیب سی آگ میں جھلستا رہا ہوں اور اب سونا چاہتا ہوں!

''سنو!''

''ہاں میم صاب''

''میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے میم صاب مت کہا کرو''

''لیکن میم صاب ۔ ۔ ۔''

''پھر وہی میم صاب، میرا نام انیتا ہے انیتا سمجھے ۔ ۔ ایڈیٹ۔ تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

''محبت ۔ ۔ ؟''

''ہاں ۔ ۔ بہت چاہا ہے''

''کس کو؟''

''اپنے ڈل کو، اپنے بابا کو اور زونی کو''

''زونی؟''

''ہاں میم صاب زونی ۔ ۔ زونی میری بیوی''

ڈل جھیل ۔ ۔ میں اسی ڈل جھیل کا باسی ہوں۔ یوں تو میرا نام سلطان ہے لیکن میں پمپوش کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ کوہ سلیمان کے دامن میں لمبی اور طویل سڑک کے ساتھ ساتھ ڈل جھیل کے وسیع سینے پر ہاؤس بوٹوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔ ان ہاؤس بوٹوں میں

دیش دیش اور بھانت بھانت کے لوگوں کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں اور جو سفید رنگ کا خستہ صورت ہاؤس بوٹ نظر آتا ہے جس کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں ہے اور جس پر لکھا ہے ۔ ۔ ۔ پمپوش۔ یہ ہاؤس بوٹ میرا ہے۔ یہ نام میرے بابا نے رکھا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے ہر بار محسوس ہوتا ہے کہ بابا کی بے وقت موت کے ساتھ میرا پمپوش بھی اپنی ساری رعنائی، اپنی ساری خوبصورتی کھو چکا ہے۔ میں نے اپنے ہی پمپوش میں زندگی کی بڑی گہرائیاں دیکھی ہیں، بڑی بلندیوں کو چھوا ہے، خوبصورتیوں کو بھی اپنایا ہے اور بدصورتیوں سے بھی پیار کیا ہے۔ یہ جھیل جس قدر خوبصورت ہے میری زندگی اب اُسی قدر بدصورت بن کر رہ گئی ہے۔ یہ لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو میرے سینے میں آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور یہ آگ بغیر کسی آواز کے ہر شے کو راکھ بنا دیتی ہے اور یہ راکھ کبھی زونی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی انیتا کا لب ولہجہ اپنا لیتی ہے۔ زونی تو میری اپنی تھی اور انیتا ۔ ۔ ۔ بھرے بھرے جسم والی انیتا کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومتی ہے تو ایک آواز اب بھی کانوں سے ٹکراتی ہے ۔ ۔

''سلطان''

زونی میری بیوی تھی، ڈل کی دلہن تھی اور ڈل کی ہی گہرائیوں میں چلی گئی۔ ایک سیلاب آیا اور زونی کو بہا کر لے گیا۔ زونی سیلاب کی نذر ہوگئی، لاش بھی نہ ملی۔ کوئی قبر نہ بنی اور زندگی میں مجھے پہلی بار اس انجانے دیش کے اَن دیکھے شہزادے کی موجوگی کا احساس ہوا جو کچے موتیوں کے پکنے کے انتظار میں کسی ایک قبر میں سو رہا ہے۔ اس شہزادے کو میں نے نہیں دیکھا ہے لیکن ایک شکستہ قبر میں نے ضرور دیکھی ہے جہاں وہ شہزادہ ابدی نیند سو رہا ہے، لیکن میں اپنی زونی کو کہاں تلاش کروں، کس قبر میں تلاش کروں؟

اور ایسے میں ایک دن انیتا چلی آئی۔ جب پمپوش بنا تھا تو انیتا کا باپ پہلا شخص تھا جو پمپوش میں ٹھہرا تھا۔ تب پمپوش نیا نیا بنا تھا۔ اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اُس شام میں اپنی تنہائیوں میں کھویا ہوا تھا کہ سڑک کے اُس پار سے آواز آئی ۔ ۔

''سلطان''

میں ہاؤس بوٹ سے اپنے شکارے میں سڑک کی جانب چلا آیا۔

''سلطان! یہ میم صاب صرف تمہارے ہاؤس بوٹ پمپوش میں رہنا چاہتی ہے''

میں نے اپنے من میں سوچا ۔ ۔ ۔

''کیوں رہنا چاہتی ہے میرے ہاؤس بوٹ میں ۔ ۔ شاید پمپوش کی موجودہ حالت کی جانکاری نہیں ہے اسے''

''میم صاب یہ سلطان ہے پمپوش کا مالک''

''میرا سامان ٹیکسی سے اُتار کر ہاؤس بوٹ میں لے جاؤ''

میں خاموش رہا ۔ ۔ !

''کیا سوچ رہے ہو؟ میرے ڈیڈی کہتے تھے کشمیری مہمان نواز ہوتے ہیں۔ میں پہلی بار کشمیر آئی ہوں اور صرف تمہارے ہی ہاؤس بوٹ میں رہنا چاہتی ہوں۔ ڈیڈی جب یہاں آیا کرتے تھے تو صرف تمہارے ہاؤس بوٹ میں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ تم ہی سلطان ہو نا؟''

''ہاں''

''میں سیٹھ رشی کیش کی بیٹی ہوں''

یہ نام سن کر ایک دھندلی سی صورت میری نظروں کے سامنے اُبھری۔ اس کا مختصر سا سامان شکارے میں اُتارا گیا۔

''یہ پہاڑی سفر سندر تو ہے لیکن بورنگ بھی۔ سنو شکارا آہستہ سے چلاؤ''

''گھبراؤ مت میم صاب''

شکارے سے ہاؤس بوٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی۔ کہنے لگی ۔

۔ ۔ ۔

''مجھے سہارا دو''

میں نے ہاتھ تھام لیا۔ کافی مدت کے بعد کسی کے ہاتھوں کی نرمی کا احساس ہوا۔ میں نے زونی کے بعد پہلی بار کسی جوان لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ زونی کے ہاتھ میرے ہاتھ میں تھے۔ وہ ہاتھ سندر تھے، محبت کرنے والے ہاتھ، محنت کرنے والے ہاتھ، بھیگی ہوئی حنا آلود انگلیاں ۔ ۔ میری کھردری انگلیوں کو چھو رہی تھیں۔

''سلطان''

''میم صاب''

''میں پو پھٹنے سے پہلے بیڈ ٹی پینے کی عادی ہوں ۔ ۔ ملے گی نا؟''

''ہاں ضرور ۔ ۔''

جب زونی زندہ تھی وہ روز سویرے مجھے جگا کر کہتی ۔ ۔

''اب اٹھو ۔ ۔ بہت دیر ہو چکی ہے، تمہارے لئے کب سے چائے تیار کر رکھی ہے، نمکین چائے ۔ ۔''

زونی کے چہرے کا رنگ بھی کچھ کچھ نمکین تھا اور یہ رنگ ایک دن بے رنگ ہو گیا۔

''سلطان''

''جی میم صاب''

''تم زونی کے بارے میں اب بھی سوچتے ہو؟''

''ہاں بہت سوچتا ہوں، اکیلا ہوں نا''

''تم اکیلے نہیں ہو سلطان''

''اور کون ہے میرا''

''میں جو ہوں''

''میم صاب آپ''

''ہاں میری طرف دیکھو۔ تمہاری زونی کا نیا روپ ہوں میں''

انیتا کا یہ روپ میرے لئے نیا تھا اور عجیب بھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن انیتا نے آنکھوں کی جنبش سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری ۔ ۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گی''

''کہاں'' ۔ ۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''اپنی دنیا میں''

''لیکن میری زونی، میرا گھر، میری جھیل''

''زونی مر چکی ہے۔ میں تمہارے لئے ایک نیا گھر بناؤں گی اور اُس کا نام ہوگا پمپوش ۔ ۔ ایک نئی جھیل کی تخلیق کروں گی۔ اپنے ماحول کا انسان بناؤں گی۔ اپنی سوسائٹی میں جگہ دلاؤں گی''

میری دنیا پیچھے رہ گئی اور میں انیتا میڈم کے ساتھ ایک نئی دنیا میں چلا آیا۔ یہ ماحول میرے لئے نیا تھا۔ یہ لوگ میرے لئے اجنبی تھے، لیکن اس اجنبیت میں مجھے انیتا اپنی دکھائی دے

رہی تھی۔ایک وہی تو سہارا تھی۔لیکن رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا یہ دنیا میری نہیں۔

دل بے قرار رہنے لگا۔ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب انیتا پارٹی میں کسی کی بانہوں میں لہرانے لگتی تو مجھے زونی یاد آجاتی۔ وہ تو کسی اجنبی کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی تھی، حالانکہ ہمارے ہاؤس بوٹ میں اپنے نہیں بلکہ ہمیشہ اجنبی ہی ٹھہرتے تھے اور انیتا تو مجھے یہاں اپنا بنا کر لائی تھی زونی کا روپ اپنا کر۔ پھر یہ تبدیلی کیوں، ان لوگوں سے اس کا ملنا کیوں۔ میری زونی اجنبی بانہوں میں کیسے جاسکتی ہے۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ شراب کی چسکیاں کیسے لے سکتی ہے، نیم عریاں لباس میں اپنے بھرے بھرے جسم کی کیسے نمائش کرسکتی ہے؟ یہ تو گناہ ہے!

''انیتا یہ سب کیا ہے؟''

''تم نہیں جانتے، اس سوسائٹی کو اپنانے کے لئے یہ ضروری ہے۔تم جو یہ شان وشوکت دیکھ رہے ہو، یہ کاریں، نوکر چاکر، بڑے بڑے کنٹریکٹ ۔ ۔ ۔ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے''

''اور زونی ۔ ۔ میری زونی''

''میں تمہاری زون ہوں ۔ ۔ زونی''

''لیکن میری زونی نے ایسا کبھی نہیں کیا ۔ ۔ وہ مقدس تھی ۔ ۔ زون چاند کو کہتے ہیں اور چاند کو کوئی نہیں چھوسکتا''

''جاؤ میرے جنگلی دوست۔ جاکر اپنے کپڑے بدل کر آؤ۔کوئی بڑھیا سا سوٹ پہنو۔آج یہاں ایک بڑی پارٹی ہورہی ہے۔ٹینڈر منظور کرانے ہیں ۔ ۔ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔تم ان کو خوب پلانا ۔ ۔ پلا پلا کر بے ہوش کردینا۔باقی میں خود سنبھال لوں گی ۔ ۔

اگر ہم آج کی بازی جیت گئے تو میں ۔ ۔ میں تمہارے لئے ۔۔ ''

وہ خاموش ہوگئی۔ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

انیتا بازی جیت گئی لیکن یہ بازی جیتنے کے لئے مجھے اپنا سب کچھ لٹانا پڑا ۔ ۔ اپنی خودداری، اپنی تہذیب، اپنے اصول ۔ ۔

اُس رات میں نے ایک خواب دیکھا، جیسے ڈل میں ایک بار اور سیلاب آیا ہو اور میرے سارے پہاڑی پھول، پہاڑی گیت جھیل ڈل کی گہرائیوں میں کھو چکے ہوں۔ پری محل کی پُرسوز اور پُر درد آوازیں خاموش ہوگئیں ہوں ۔ ۔ میں نے سوچا، انیتا شاید انیتا نہیں بلکہ بے موسم کا بادل ہے اور میں اس کی دنیا سے پھر اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔

اور اب مجھے کچے موتیوں کے پکنے کا انتظار ہے۔

ایک معمولی آدمی

بیگم سلمان بٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ان آنکھوں میں میرے لئے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جب اس کی تہہ میں اُترنے کی کوشش کی تو پانچ سالہ پرانی کہانی میرے ذہن کے پوشیدہ گوشوں میں اُبھرنے لگی۔ اس کہانی کے صرف چار کردار ہیں ۔ ۔ میں اور بیگم عاشمہ سلمان بٹ۔ ہم دونوں کا آپس میں بھائی بہن کا رشتہ ہے۔ عاشمہ عمر میں چھ سال مجھ سے چھوٹی ہے۔ اس کہانی کا تیسرا کردار نادر ہے۔ نادر سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی خاندانی یا خونی رشتہ نہیں ہے، لیکن عاشمہ اور نادر ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ اپنی تعلیمی زندگی کے دوران وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور آہستہ آہستہ ان کی قربت محبت کی صورت اختیار کرگئی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ محبت اندھی ہوتی ہے، نہ تو امیرانہ شان وشوکت دیکھتی ہے اور نہ ہی لاچاری اور غربت کے پس منظر میں جھانکتی ہے۔ عاشمہ اور نادر اپنی محبت کی آبیاری کے لئے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے یہ رشتہ ہرگز ہرگز منظور نہ تھا۔ میں اور میری بہن عاشمہ ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے باغ باغیچے ہیں، اچھی خاصی آمدنی ہے۔ ہم دونوں کے والدین کچھ عرصہ قبل انتقال کرچکے ہیں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد میں ہی اُن کا بزنس چلا رہا ہوں بلکہ اس بزنس کو کافی وسعت بھی دے چکا

ہوں۔ میں نے اپنی بہن عاشمہ کی پرورش، تعلیم وتربیت اور رہن سہن کی جانب کبھی کوئی لاپرواہی نہیں برتی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی کبھی نظرانداز نہیں کیا، لیکن جانے کیوں میں ان دونوں کی محبت اور چاہت کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ نادر ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میری بہن کو زندگی کی آسائشیں فراہم کرنے کے قابل نہ تھا۔ البتہ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ کافی پڑھا لکھا تھا۔ لیکن صرف پڑھائی لکھائی زندگی کی شادابیت نہیں بن سکتی۔ یوں تو وہ ایک صحافی تھا، ایک قلم کار، لیکن محدود آمدنی تھی اُس کی۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عاشمہ کے حصے کی زمین وجائیداد، زرزیور اور اثاثوں کا مالک کوئی ایسا فرد بنے جس کے پاس اپنا کچھ نہ ہو اور پھر صحافتی دنیا میں ابھی اُسے جانتا ہی کون تھا۔

''بھیا میں جانتی ہوں کہ صحافتی دنیا میں نادر کو ابھی بہت زیادہ تجربہ حاصل نہیں ہے لیکن وہ پڑھا لکھا ہے۔ اس کے قلم میں بڑی قوت ہے اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب اس کا اپنا ایک نام ہوگا، ایک مقام ہوگا اور پھر ۔ ۔ ۔ محبت بجائے خود ایک بڑی دولت ہے، اثاثہ ہے اور یہ دنیاوی اثاثے بظاہر خوبصورت لگتے ہیں لیکن محبت کے مقابلے میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ پھر بھی ہم !!''

''پھر کیا عاشمہ ؟'' ۔ ۔ میں نے پوچھا۔

''میں آپ کو بہت چاہتی ہوں، بہت پیار کرتی ہوں۔ آپ کے علاوہ میرا بھی کون ہے۔ ۔ ۔ ۔ میں آپ کے لئے کوئی بھی قربانی دینے سے انکار نہیں کروں گی۔ آپ آزما کر دیکھ لیجئے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ!''

''کیا لگتا ہے تمہیں، عاشمہ ۔ ۔ ''

”آپ اپنا من بنا چکے ہیں۔ آخر آپ کی بھی کوئی مجبوری ہوگی اور شاید آپ مجھے اس مجبوری سے آشنا نہیں کرنا چاہتے“

اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اگرچہ دبے لفظوں میں وہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر چکی تھی لیکن میں نے اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ کی خاطر اس کی نا کو اپنی ہاں میں بدل دیا اور ایک امیر گھرانے کے اکلوتے وارث سلمان بٹ کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھ دیا اور یہی سلمان بٹ اس کہانی کا چوتھا کردار ہے۔ میں اس بات سے بے حد خوش تھا کہ اپنے نئے گھر اور نئے ماحول میں عاشمہ نے کچھ اس طرح سے سمجھوتہ کر لیا کہ ظاہری طور پر کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ ایک بیوی کے روپ میں اُس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں، شکوہ وشکایت کی ایک ہلکی سی لکیر بھی اس کے ماتھے پر کبھی دکھائی نہ دی۔ اس نئی زندگی کو اپناتے ہوئے عاشمہ نے کبھی نادر کے بارے میں سوچا یا اس کی یادیں عاشمہ کے ذہن ودل سے اُتر چکی تھیں، میں نہیں جانتا، بالکل نہیں جانتا۔ اُس نے یا میں نے اس تعلق سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ ان دونوں کے محبت کی کتاب بند ہو چکی تھی۔

اچانک عاشمہ کو ایک دن اَن دیکھے المیہ کا سامنا کرنا پڑا۔ سلمان بٹ ایک سڑک حادثے میں اپنی جان کھو بیٹھا۔ عاشمہ کی زندگی کی ساری مسرتیں، ساری خوشیاں بکھر کے رہ گئیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اب عاشمہ کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی وہ بے سہارا تھی۔ اب اس کے خوابوں میں رنگ بھرنے والا بہت دور جا چکا تھا۔ اس کی محبت کو پیاس بجھانے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے جذبات اور احساسات کو سمیٹنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی تنہا، اندھیری اور خاموش راتوں میں رنگ بھرنے والا کوئی نہ تھا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی ۔ ۔

بتیس سال۔ بھلا بتیس سال عمر بیوہ ہونے کی عمر ہوتی ہے۔ یہ تو محبت کی راہوں میں گل بوٹے کھلانے کی عمر ہوتی ہے اور مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ مرنے کے بعد دھن دولت، اثاثوں اور زر زمین کی کوئی قیمت نہیں، کوئی وقعت نہیں، کوئی قدر نہیں۔ عاشمہ کو اس بات کا بھی دُکھ تھا کہ پانچ سالہ ازدواجی زندگی میں وہ سلمان کے بچے کی ماں نہ بن سکی۔ سلمان کی وراثت کو سنبھالنے کے لئے وارث نہ دے سکی۔ اس کے لئے وہ خود کو ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔

''بھیا میری کوئی اولاد ہوتی تو آج ویرانیوں اور تنہائیوں کا احساس نہ جاگتا''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

''آج میں اکیلی رہ گئی ہوں بالکل اکیلی''

دفعتاً نادر کی صورت میری نظروں کے سامنے آگئی اور میں سوچنے لگا کہ اگر عاشمہ اور نادر کی شادی کے لئے میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہوتا تو شاید ۔ ۔ ۔ شاید میری بہن کو اس عمر میں بیوگی کا لبادہ نہ اوڑھنا پڑتا۔

گزرے ہوئے لمحات کے اندر جھانکتے ہوئے ایک نئی سوچ میرے ذہن میں اُجاگر ہوئی، نادر اور عاشمہ کی شادی۔ لیکن میں خاموش رہا۔ اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے پہلے میں نے عاشمہ کی آنکھوں کی جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ ان آنکھوں میں اب بھی میرے لئے نفرت ہے۔

بہت سارے شب و روز بے عنواں گزر گئے۔

اور میں نے خاموشی سے نادر کی تلاش شروع کر دی۔ پہلے اس کے گھر گیا۔ وہ اپنا گھر کب کا چھوڑ چکا تھا۔ وہاں جو لوگ رہتے تھے وہ نادر کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔ پھر اخباری

دفتروں میں نادر کو تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی، لیکن میں اپنی کوششوں میں ناکام ہو رہا تھا۔ مایوسی کے عالم میں ایک دن یہاں کے ایک معروف اخبار کے دفتر میں مجھے روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔

''جی ہاں ! نادر ہمارے اخبار میں کام کرتا تھا لیکن وہ اپنا نام بدل کر قلمی نام سے لکھنے لگا تھا اور اس کی تحریروں کو پڑھنے والے اُس کے اصل نام سے ناواقف تھے۔ وہ صرف اپنے قلمی نام سے جانا جاتا تھا۔ کیا بتاؤں اُس کے قلم میں کس قدر قوت تھی، اُس کی تحریروں میں کس قدر ندرت تھی، ایک نیا پن تھا، ایک نیا انداز، ایک نیا اسلوب تھا۔ وہ ایک بہت ہی قابل اور منفرد انداز کا فوٹو گرافر بھی تھا۔ وہ سچ اور سچائی کا پرستار تھا۔ اس نے کبھی بھی ۔ ۔ !''

''کیا اب وہ یہاں کام نہیں کرتا'' ۔ ۔ میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو ۔ ۔ آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی اُن سے آپ کی''

''کافی عرصہ پہلے ۔ ۔ شاید پانچ برس قبل''

''پانچ برس قبل ۔ ۔ ؟''

''اچھا یہ تو بتایئے، آپ اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے، اُن کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا''

''جانتا تو یہاں کیوں چلا آتا''

''تعجب ہے کہ آپ اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے''

''کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں'' ۔ ۔ میں نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹتے ہوئے جاننا چاہا۔

''کیسی مدد؟''

’’میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں‘‘

مدیر اپنی کرسی سے اُٹھے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی چابی میرے سپرد کی ۔ ۔

’’یہ چابی لیجئے۔ سامنے برآمدے کے اُس پار جو دروازہ نظر آرہا ہے، وہ کھول کر اندر جائیے۔آپ کو نادر کے بارے میں پوری جانکاری ملے گی‘‘

میں نے لرزتے ہاتھوں سے چابی تھام لی اور دروازہ کھول کر ہال کے اندر چلا گیا۔ یہ ہال خالی تھا لیکن دیواروں پر بہت ساری تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ دفعتاً نادر کی تصویر دیکھ کر میری نظروں کی روشنی جیسے تاریکی میں بدل گئی۔تصویر کے نیچے لکھا تھا ۔ ۔ ۔

’’بے باک، بے خوف اور نڈر صحافی۔جس نے سچائی اور صحافتی پیشے کی عظمت کے لئے برق رفتار گولیوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے کیمرے میں وہ تصویریں عکس بند کیں جواب نہ صرف ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گی‘‘

تصویر اور تحریر کے نیچے تاریخ وفات تھی، دن بھی لکھا تھا۔اب میں کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں کہ دن بھی وہی تھا اور تاریخ بھی وہی تھی جس دن سلمان بٹ ایک حادثہ میں اپنی جان کھو بیٹھا تھا اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دوسری المناک خبر سن کر بھی عاشمہ کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کا جذبہ اُبلتا رہے گا۔

☆ ☆

کال بیل

میں اپنی نئی کہانی کے خدوخال سنوار ہی رہا تھا کہ میری انگلیوں کی جنبش رُک سی گئی اور میرا قلم تھم سا گیا۔ باہر کال بیل بار بار بج رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر آیا۔ گھر کے لان کے قریب ایک جوان عمر لڑکی بے تاب نظروں سے دروازے کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا بات ہے۔۔؟'' میں نے پوچھا

''بابو جی کچھ دیجئے۔۔ میری مدد کیجئے''

میں نے اُس کی جانب اپنی کھلی کھلی نگاہوں سے دیکھا۔ یوں تو اُس نے اپنے جسم کو کشمیری طرز کے لباس میں چھپا رکھا تھا لیکن اُس کے چہرے کی رنگت، چہرے کی بناوٹ اور لب ولہجہ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ کشمیری نہیں ہے۔

''معاف کرو بی بی۔۔ گھر میں کوئی نہیں ہے''

''آپ تو ہیں''

''ہاں میں تو ہوں''

''آپ ہی دیجئے نا''

''کوئی زبردستی ہے کیا''۔۔ میں نے کہا

''نہیں زبردستی نہیں ہے، لیکن۔۔؟''

"لیکن کیا؟"

"شام اُترنے والی ہے اور میں اپنے گھر نہ جا سکی تو ۔ ۔ تو رات ۔ ۔ ؟"

"رات کو کیا؟" ۔ ۔ میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے ہاں رُکنا پڑے گا رات بھر" ۔ ۔ اُس نے ٹھہراؤ بھرے لہجے میں کہا۔

"یہاں ۔ ۔ میرے ہاں ۔ ۔ رات بھر؟"

"جی ہاں، آپ پچاس روپے دیجئے میں گھر چلی جاؤں گی۔ ابھی گاڑی مل سکتی ہے، دور جانا ہے نا۔ بہت کرایہ لگتا ہے ۔ ۔ ورنہ رات بھر ۔ ۔!"

میرے افسانوی ذہن میں ایک عجیب سی اَن دیکھی سی انجانی سی افسانوی تحریر اُبھرنے لگی ۔ ۔ گھر ۔ ۔ اکیلا پن ۔ ۔ خاموشی اور پھر شام بھی اُترنے والی ہے۔

"بابو جی کیا سوچ رہے ہیں آپ ۔ ۔ اندر آؤں یا آپ ۔ ۔"

"رُک جاؤ"

میں کمرے کے اندر چلا گیا اور اپنے پرس سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر باہر لوٹ آیا۔

"یہ لو اور چلتی بنو"

پچاس روپے کا نوٹ تھامے وہ مسکرانے لگی اور مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

اُس کے جاتے ہی اچانک میری سوچوں کی صحرا میں پیاس کی شدت بڑھنے لگی۔ جانے والی شاید میرے لئے بادل کا روپ اپنا کر آئی تھی۔ بادل برسے گا، بارش آئے گی اور آہستہ آہستہ میرے وجود کی دھرتی سیراب ہوگی ۔ ۔ میں نے لان پار کر کے دروازہ کھولا، شاید یہ جاننے کے لئے کہ کیا وہ واقعی چلی گئی ہے یا لوٹ کر آئے گی رات بھر رُکنے کے لئے میرے یہاں ۔ ۔ !

وہ گلی میں موجود تھی لیکن اکیلی نہ تھی۔ ایک جوان جوان سا ہم عمر لڑکا ساتھ میں کھڑا تھا۔ وہ پچاس پچاس کے نئے پرانے نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

دفعتاً ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"چندو۔ یہ بستی بڑی زرخیز لگتی ہے۔ میں لمحہ لمحہ گن رہا تھا۔ صرف چالیس منٹوں میں گھر جانے کے بہانے ابھی تک تم ساڑھے تین سو روپے کی کمائی کر چکی ہو"

"وہ تو ہے"

"لیکن"

"لیکن کیا"

"سوچ رہا ہوں"

"کیا سوچ رہے ہو بتا بھی دو نا"

"سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی تمہیں روپے نہ دیتا بلکہ رات بھر کے لئے تمہیں اپنے ہاں جگہ دیتا تو۔۔؟"

چندو کا جواب سننے سے پہلے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے کمرے کے اندر چلا آیا۔

بہت دیر تک رات گئے تک سوچتا رہا، جلتا رہا، بجھتا رہا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا اور جب میں نے دوبارہ قلم تھام لیا لکھنے کے لئے تو مجھے لگا جیسے میری کہانی کا موضوع ہی بدل چکا ہے اور میں نہ جانے حیران حیران سا کیوں اور کس کہانی کی دھوپ چھاؤں کے درمیان لٹک رہا ہوں۔ میری اپنی کہانی شاید رات کے سناٹوں میں بکھر بکھر کر گم ہو چکی تھی، لیکن میں کال بیل بجنے کی آرزو میں رات بھر جاگتا رہا۔۔ !!

تصویر کا دوسرا رُخ

حرف اوّل ۔ ۔

ان بے جان مبہم مبہم سے الفاظ کے خدوخال سنوارتے آپ شباب، سندرتا، جنون اور چاہت کی کہانی پائیں گے۔ ایک ایسی کہانی جو سرخ خوابوں کی تہہ میں سو چکی ہے۔ بدن کی لمحاتی لذت، پگھلے ہوئے جسم کی آگ اور مسلسل خاموشی ۔ ۔ یہ سب زلفوں کے اندھیرے میں کھو چکے ہیں۔ بہت عرصہ نہیں گزرا جب اس کہانی نے میرے ذہن کے کینوس پر ایک صورت پالی۔

تعارف ۔ ۔

ہم دونوں کے دلوں میں چور ہے۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی ہے اور رات اُترتی ہے تو سارا آنگن مہندی کی کچی اور موتیا کی ادھ کھلی کلیوں سے مہک مہک اُٹھتا ہے۔ مجھے کچی اور اَدھ کھلی کلیوں سے نفرت ہے۔ مجھے کھلے ہوئے پھول اچھے لگتے ہیں۔ شباب سے بھرپور پھول اور ایسے میں ماضی کے دھندلکوں اور خوابوں کے بے ترتیب مانگ کو سنوارتا ہوں۔ میرا ذہن ایک شکستہ پتھر ہے۔ سامنے انجیر کے درخت پر دو چڑیاں پھدک پھدک کر ایک دوسرے سے چونچ ملانے میں مصروف ہیں، اور ہم دونوں کے دلوں میں چور

ہے۔ یہ چور کبھی اسے بند کھڑکی کے بے آواز پٹ کھولنے پر اُکساتا ہے جہاں سے دو کالی مدھ بھری آنکھیں میرا تعاقب کرتی ہیں اور کبھی مجھے باتھ روم کی دیوار کے سوراخ میں جھانک جھانک کر اس کے سپید دودھیا جسم کو اپنی ویران آنکھوں کی گہرائی میں قید کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور جب کبھی کسی ان جانے لمحے میں ہماری نظریں ٹکرا جاتی ہیں تو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ڈر لگتا ہے۔ یہ ڈر کبھی اُسے دلھن کا روپ دیتا ہے اور زعفرانی حیا اس کے چہرے پر پھوٹنے لگتی ہے اور کبھی یہی ڈر میرے وجود پر لٹکے ہوئے مردہ سانپ کو دلھن کے سرخ بھڑکیلے لباس میں تہہ در تہہ گزر کر ندی کی گہرائیوں میں ڈبو دیتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ہی موم بن کر پگھلنے لگتے ہیں۔

باب اوّل ۔ ۔

اس بے ترتیب جہاں میں میرا وجود بکھرا ہوا ہے اور بکھرے ہوئے وجود کے ہر گوشے میں وقت کا ساون محو رقص ہے۔ میں سب کا ہوں، لیکن شاید میرا کوئی نہیں، یہ سامنے والی عورت بھی نہیں، جو شباب سے بھرپور پھول سے زیادہ خوبصورت ہے، سندر ہے۔ جس کی چکنی چکنی صندلی بانہیں مہندی کی کچی اور موتیا کی اَدھ کھلی کلیوں سے زیادہ نرم و نازک ہیں۔ جس کے سینے کے اُبھار بے حد رس دار اور عمر خیام کے پیمانوں سے زیادہ دلکش ہیں۔ وہ جب اپنے آنگن کی ہری گھاس پر مخملی پاؤں سے جادو بکھیرتی ہے اور چلتے چلتے اچانک رُک سی جاتی ہے اور اپنے کولھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر سوچوں کی بے کراہ وسعتوں میں ڈوب جاتی ہے تو جانے کیسے میرے سرہانے کی طرف کھلنے والی کھڑکی وا ہو جاتی ہے۔ یہ نمکین عورت جو شباب سے بھرپور اور پھول سے زیادہ خوبصورت ہے، میرے لئے اجنبی نہیں، غیر نہیں۔ کتنے یگ بیتے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ تب بھی وہ اتنی ہی سندر تھی۔ تب بھی

اس کے چہرے کا رنگ سرخ تھا۔ بال ایسے ہی سنہرے تھے۔ کانوں میں ایسے ہی آویزے تھے۔ ہونٹوں پر ایسی ہی مٹھاس تھی۔ جی ہاں، یہ عورت میرے لئے اجنبی نہیں، سچترا ہے، میرے دوست اور میرے ہمسایہ روی کی بیوی ہے!

باب دوم ۔ ۔

یہ دل جب اپنی ہی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو اندھیرا بڑھ جاتا ہے۔ آنکھیں دھندلا سی جاتی ہیں اور اس اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا، صرف ایک شئے کا احساس ہوتا ہے، دل کی دھڑکنوں کا۔ وہ رات بھی اندھیرے میں ڈوب چکی تھی، صرف گل مرگ کلب کے لان میں زندگی مصنوعی روشنی کی جگمگاہٹ میں پورے حسن کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ روی موہن کئی پیگ انڈیلنے کے بعد کچھ کچھ بہک رہا تھا۔ وہ غالب کی مے نوشی اور ڈومنی کے ساتھ اس کے عشق میں اُلجھنے کے بعد اب مہاجرین کی جائیداد کی فروخت پر اپنے بے ربط خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ میں اور سچترا تاش کے پتوں میں کھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں یونہی بے مقصد پتے پھینک رہا تھا۔ جب روی نے دو پیگ اور چڑھائے تو اس کے لبوں پر اچانک خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ اب چپ چاپ دور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہا تھا، لیکن وہاں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اُسے سہارا دیا۔ اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ کئی بار لڑکھڑایا، کئی بار گر گیا۔

وقفہ ۔ ۔

روی اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ مسلسل سو رہا ہے، کسی لاش کی طرح بے حس۔ مرنے کے بعد آدمی شاید ایسے ہی سوتا ہوگا۔ سچترا ابھی اسی کمرے میں ہے اور میں دوسرے کمرے میں

اپنی بے معنی سوچوں میں کھویا ہوا ہوں۔ ہم دونوں کے درمیان ایک ویران سے برآمدے کا فاصلہ ہے، لیکن پردے کی سرسراہٹ میں اس کے جسم کی حرارت محسوس کرسکتا ہوں۔ ہر شئے اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے۔ سپترا کا دودھیا جسم بھی سیمابی تھرک کے ساتھ اپنے وجود کا اظہار کررہا ہے ۔ ۔ بھرپور اور قیامت خیز۔ وہ اب دروازے کے باریک پردے کے سامنے نیم عریاں انداز میں کھڑی ہے۔ اپنے جسم کو ہلارہی ہے، جیسے انجانے میں کوئی ستار کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو۔ اُف یہ سراپا؟ میری سانس تیز چلنے لگی ہے۔ آنکھیں مسل رہا ہوں لیکن ہر شئے اپنی جگہ پر موجود ہے۔ یہ کیسا لمحہ ہے۔ دریا سامنے ہے اور میں پیاس سے ہانپ رہا ہوں۔ ہم دونوں کے درمیان یہ فاصلہ مصنوعی ہے۔ مصنوعی فاصلہ جذبات کے سیلاب کو روک نہیں سکتا۔ ہر حرکت میں اضطراب ہے۔ خاموشی میں ترنم پیدا ہوگیا ہے۔ آسمان کی نیلی سطح پر سمندر کی گہرائی اُبھر آئی ہے۔ مادے سے حرکت اور حرکت سے تخیل پیدا ہوتا ہے۔ نقطے سے قطرہ اور قطرے سے دریا وجود میں آتا ہے۔

باب سوم ۔ ۔

فرشتوں کے بدن جلتے ہیں۔ آسمانوں سے آگ برستی ہے، دھرتی جلتی ہے، پھٹ جاتی ہے۔ پگڈنڈی کا رنگ گلابی تھا اور میں سوچتا رہا، چلتا رہا، کبھی اس کنارے اور کبھی اُس کنارے۔ دونوں کناروں پر گھاس اُگ آئی تھی۔ مخملی گھاس سرنگوں تھی۔ ایک آدھ جنگلی پھول بھی تھا لیکن مرجھایا ہوا۔ سفر کی تھکان سے چور کسی الھڑ ناگ کی چاپ کا منتظر، اور میں اس پگڈنڈی کو پار کررہا تھا۔ آگے بڑھ رہا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ دھرتی جل رہی تھی۔ ایک شگاف وجود میں آرہا تھا اور میں دھیمی سانسوں کی لے پر بھرے بھرے سراپا والی سپترا کے جسم کے قوس قزح میں اُبھر رہا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بدن کی

شکتی کھو چکا تھا۔ میں لوٹ آیا۔ اس شکتی کی تلاش میں میں نے کئی روپ اپنائے، کئی روگ اپنائے!

نوٹ - -

ڈائری کے بہت سے اوراق پر نہ جانے کیسے کالی سیاہی پھیل گئی ہے، کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ آخری اوراق بچ گئے ہیں۔

اختتام - -

روی موہن اب بھی میرا دوست ہے، سپترا اب بھی اُس کی بیوی ہے، اب بھی اُس کے سینے کے انار رس دار ہیں، بال سنہرے ہیں، ہونٹوں پر مٹھاس ہے اور ہم دونوں کے دلوں میں اب بھی چور ہے۔ لیکن وہ لمحہ زندگی میں ایک بار آتا ہے، آ کر گزر چکا ہے۔ کہتے ہیں لمحے لوٹ کر نہیں آتے، اور وہ لمحہ بھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

ایک اخباری خبر - -

پچھلے دنوں پولیس نے اپنی نوعیت کے ایک دلچسپ کیس کا انکشاف کیا۔ شری روی موہن جو ایک سینئر آفیسر ہیں، نے اپنی بیوی کے ساتھ دست درازی کرنے کے الزام میں اپنے ایک دوست اور ہمسایہ کیپٹن وکرم اگروال کی پولیس سے شکایت کی۔ تحقیقات کے دوران ملزم وکرم اگروال کو میڈیل بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد کیپٹن وکرم اگروال کو باعزت بری کر دیا گیا اور روی موہن نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وکرم کرگل جنگ کے دوران حادثے میں قوت مردانگی کھو چکا ہے۔ البتہ اپنی سوچوں سے انتقام لینے کے لئے وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔

اللہ خیر کرے

میں آج کی نہیں بلکہ اُس دور، اُس زمانے کی بات کر رہا ہوں، جب ہمارے دیکھتے دیکھتے حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا تھا کہ ہماری پھولوں کی وادی ایک جلتے ہوئے گھر کی مانند نظر آنے لگی تھی اور اس جلتے ہوئے گھر میں پھولوں سے محبت کرنے والوں کی تمنائیں جل جل کر سلگ سلگ کر راکھ بن رہی تھیں۔ صبح کا سورج خون میں نہلایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وقت کس قدر بے رحم اور سنگ دل ہو چلا تھا کہ آپسی رشتے بیمار سے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں اُن دنوں شہر خاص کی ایک پولیس چوکی کا انچارج تھا۔ شہر میں اکیلا رہتا تھا۔ میری ماں، میری بیوی اور میرے دو بچے اپنے آبائی گاؤں میں قیام پذیر تھے۔ دونوں بچے گھر سے ذرا دور ایک مقامی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور اپنی ماں کی رہنمائی میں اپنی تعلیم میں خوب دلچسپی لے رہے تھے۔ اساتذہ بھی اُن کی کارکردگی سے مطمئن نظر آتے تھے۔ میں مہینے میں دو ایک بار اپنے گاؤں جا کر بیوی اور بچوں کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتا تھا۔ اپنے قریبی ہمسایوں اور رشتہ داروں سے مل بھی لیتا تھا۔ اُن کو کچھ اپنی سناتا اور کچھ اُن کی سنتا۔ لیکن جب حالات نے ناموافق صورت حال اختیار کی تو میرا گھر جانا اور اپنے گھر والوں سے ملنا جلنا ناممکن بنتا گیا۔ البتہ کبھی کبھار فون سے اُن کی خیر و خیریت جاننے کی کوشش کرتا۔ میں نے اُنہیں فون کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ اُس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے سارا سارا دن لوگوں کی بھیڑ

اور جلسے جلوس کو تتر بتر کرنے کے لئے پولیس کی چوکی سے باہر رہنا پڑتا تھا اور رات گئے چوکی آکر اُن لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنا میرا معمول بن چکا تھا، جنہیں میرا اسٹاف ہنگامہ آرائی کرنے کی پاداش میں گرفتار کر کے چوکی میں بند کرتا تھا۔ ایسا کرتے وقت مجھے اکثر اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی قوت سے کام لینا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار میرے ہاتھ اور میرے پاؤں اس قدر بے قابو ہو جاتے کہ میرا اسٹاف لرز لرز سا جاتا تھا۔ حالات روز بروز اس قدر بگڑتے جارہے تھے کہ ہمیں ہر لمحے کسی نہ کسی اَن دیکھی اور انجانی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب تو بچے بھی سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر لئے، ہونٹوں پر اپنی چاہت کی آواز لئے۔ اکثر مجھے لگتا تھا کہ ان آوازوں میں ایک جوش ہے، ایک عزم اور ایک ولولہ ہے، لیکن اس عزم اور اس ولولہ کو دبانا اور اُن کے ہاتھوں سے پتھر چھیننا ہماری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ان ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے جانے کتنے معصوم معصوم سے بچے اور جوان اپنی آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکے تھے، کتنے سینے چھلنی ہو چکے تھے، کتنے سارے اپاہج ہو گئے تھے، کتنے سارے خواب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، کتنے پھول کھلتے کھلتے مرجھا گئے تھے۔

اور وہ شام میری زندگی کی ایک بے رنگ شام تھی، شاید بے رحم بھی۔ میں نے دیر گئے تھکے تھکے قدموں سے اپنی پولیس چوکی کا رُخ کیا۔ گرم گرم چائے کا ایک کپ پی کر ذرا سی بشاشت محسوس کی اور پھر حسب معمول اسٹاف کو آج کے گرفتار کئے گئے افراد کو پیش کرنے کی ہدایت دی۔

ذرا دیر بعد پندرہ سولہ سالہ عمر کے دو لڑکوں کو میرے سامنے پیش کیا گیا۔

''تم اور سنگ بازی ۔ ۔ !''

"نہیں، ہم نے کچھ نہیں کیا ۔ ۔ہم بے قصور ہیں، سرراہ چلتے چلتے ہمیں پکڑلیا گیا"

اُن کی سنی کو اَن سنی کرتے ہوئے ایک جلاد کی طرح اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور پھر میرے یہ ہاتھ حرکت میں ہی رہے۔اب کمرے میں اُن کی چیخوں کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"سر" اچانک چوکی کا منشی دوسرے کمرے سے آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ ۔ "سر آپ کے گھر سے فون ہے، لینڈ لائن پر۔آپ کی بیگم صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں ۔ ۔ ابھی ۔ ۔ اسی وقت ۔ ۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھیں ۔ ۔ !"

میرے ہاتھ رُک گئے۔میں منشی کے کمرے میں چلا گیا۔

"ہیلو ۔ ۔ ہیلو، ساجدہ کیا بات ہے ۔ ۔ کیا ہوا ہے وہاں ۔ ۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو ۔ ۔ کچھ تو کہو ۔ ۔ تم رو کیوں رہی ہو ۔ ۔ کیا کہا ۔ ۔ ہمارے دونوں بچوں کو پولیس سنگ بازی کے الزام میں پکڑ کر لے گئی ہے ۔ ۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہیں، بے قصور ہیں ۔ ۔ تم نے چوکی کے انچارج سے بات نہیں کی ۔ میرا نام نہیں لیا ۔ ۔ ہاں ہاں میں اُن کے رونے کی آوازیں محسوس کر سکتا ہوں، اُن کی درد بھری چیخیں سن سکتا ہوں۔ہاں ہاں میں جانتا ہوں ساجدہ کہ یہ میرے بچوں کے رونے کی آوازیں نہیں ہیں، اُن کی چیخیں نہیں ہیں ۔ ۔ یہ تم جن بچوں کی آوازیں اور چیخیں سن رہی ہو، وہ جانے کس کے بچے ہیں۔ہم انہیں پکڑ کر لائے ہیں اور اُن کی پوچھ تاچھ چل رہی ہے ۔ ۔ دیکھو تم گھبراؤ نہیں، حوصلہ رکھو ۔ ۔ کیا ۔۔ ۔ کیا کہہ رہی ہو تم ۔ ۔ یہ بچے بھی ہمارے بچوں کی طرح بے قصور اور بے داغ ہو سکتے ہیں ۔ ۔ ! !

میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔سوچ رہا ہوں، کیا واقعی میرے بچے بے قصور ہیں۔اگر

میرے بچے بے قصور ہیں تو یہ دولڑکے، یہ دو بچے جو میری جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں، بے قصور کیوں نہیں ہو سکتے ۔ ۔ !

''منشی جی''

''جی سر ۔ ۔''

''ان دونوں بچوں کو بحفاظت اِن کے گھر چھوڑ آؤ ۔ ۔ !''

اب میں شہر سے اپنے آبائی گھر آ چکا ہوں۔ اپنے گھر میں رہتا ہوں۔ کئی برس قبل نوکری سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ آج شاید اس لئے میرے ذہن کے دریچے کھل گئے اور مجھے اپنی پرانی باتیں یاد آنے لگیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے اور پھولوں کی وادی ایک بار پھر جلتے گھر کی مانند نظر آنے لگی ہے!

اللہ خیر کرے ۔ ۔ ! !

کون ہے میرا یہاں

(ڈائری کے اوراق پر مشتمل افسانہ)

زندگی کے راستے بہت ہی عجیب ہیں اور ان راستوں پر زندگی کبھی تو بہار کی طرح کھل اُٹھتی ہے اور کبھی موسم سرما کی طویل برفانی راتوں کی طرح سامنے کھڑی ہو جاتی ہے، اپنے اپنے مقدر کی بات ہے شاید۔ جب سے یہاں آئی ہوں احساس کی نرم و نازک کرچیاں سارے وجود کو ڈس رہی ہیں۔ اس ماحول میں خود کو سنوارنا سجانا اپنی ذات سے باہر جھانکنا اپنے بس کی بات نہیں۔ معلوم نہ تھا کہ وقت کسی دن اپنوں سے اتنی دور بھی کھڑا کر دے گا۔ اسکول کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہوٹل سپنا کا یہ کاؤنٹر زندگی کا ایک حصہ بن جائے گا اور ہر شام کئی چہروں اور کئی لوگوں سے سامنا ہوگا۔ کل ملا کر چھ ہزار روپے بنا لیتی ہوں ہر ماہ، اور یوں نشی کی فیس اور ماں کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ہوٹل کا ماحول کچھ عجیب سا ہے۔ لڑکیاں بھٹکنے بھٹکنے کے بعد جب چوروں کی طرح دبے دبے قدموں سے یہاں سے لوٹ جاتی ہیں تو میرے دل کی سڑک پر جیسے کوئی زور زور سے چلتا ہے۔ میں ریتا کپور کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ میری ہی ذات کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ وہ میرے یہاں نہ ہوتی تو میں شاید اس ہوٹل میں کبھی Receptionist بن نہ پاتی۔ اتنے بڑے ہوٹل کے مالک کی اکلوتی بیٹی ہو کر بھی وہ کتنی اچھی ہے، لیکن کتنی زیادہ زخم خوردہ، بے حد جذباتی لڑکی ہے ریتا۔ اکثر بات کرتے

کرتے جذباتی ہو جاتی ہے اور ایسے میں اس کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں اس کی ساری کہانی سمٹ آتی ہے۔ میں نے اس کہانی کو کئی بار پڑھنے کی کوشش کی۔ ہر بار اس کہانی میں ایک ان دیکھے سے پھیلاؤ کا احساس اُبھرتا ہے۔ اُس کی کہانی جیسے اختتام تک پہنچتے پہنچتے پھر بکھرتی چلی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ نہ جانے اس کا کوئی انجام بھی ہے یا نہیں؟

رات بہت بیت گئی ہے۔ اب مجھے سونا چاہیے۔ کل سویرے ساڑھی بھی پریس کرنی ہے اور اسکول جانے کے لئے تیار ہونا ہے۔

دوسرا ورق

ریتا کے ساتھ بہت دیر تک اُس کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ وہ میرے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہے۔ شاید وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتی ہے۔ وہ چاہے تو ہر لمحہ، ہر دوپہر، ہر شام اور ہر رات اپنے ہوٹل کا کوئی گوشہ چُن کر وقت بتا سکتی ہے اور ہوٹل کی اصلی نقلی سندرتا میں کھو سکتی ہے، لیکن ان سب چیزوں میں ریتا کے لئے کوئی کشش نہیں۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی لڑکی ہے جو اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتی ہے اور ایک وجود بن کر جینا چاہتی ہے۔ وہ ایک ایسی شاخ ہے جو وقت سے پہلے ہی لچک گئی ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی ربط کوئی تسلسل نہیں۔ ان بے ربط اور بے تسلسل باتوں میں ایک دلیل ضرور ہوتی ہے، ایک وزن ہوتا ہے، ایک پھیلاؤ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، پیسہ سچ مچ سب کچھ نہیں۔ اگر پیسہ ہی سب کچھ ہوتا تو وہ ایک مفلس کی سی زندگی کیوں گزارتی۔ وہ بولتی ہے تو میں چپ چاپ سن لیتی ہوں۔ اُس کے لئے بولنا اچھا بھی ہے، کیونکہ جب وہ خاموشی کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے تو مجھے ڈر سا لگتا ہے۔

سکول میں کنڈر گاٹن کی کچھ بچیاں بہت شریر ہیں اور شریر بچے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ نشی بھی بہت شریر تھی اپنے بچپن میں۔ موسم ان دنوں بہت پیارا ہو گیا ہے۔ پورے چاند کی رات بار بار پال کا خیال دلاتی ہے اور میں بہت دیر تک یادوں کی پگڈنڈیوں پر نکل جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ اور ہاں کل کمرے کی کھڑکیوں کے لئے پردوں کا انتظام کرنا ہے۔ فاختائی رنگ مجھے پسند ہے اور پال کو بھی۔

تیسرا ورق

ریتا کی باتوں سے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس کا باپ انصاف نہیں کرے گا ریتا کے ساتھ۔ بیٹی جوانی کی دہلیز پر تنہا کھڑی ہے۔ اس عمر میں کھلونوں سے دل نہیں بہلایا جاسکتا؟ ماں کی بے وقت موت نے اس کے ذہن پر گہرے اُداس نقوش چھوڑ رکھے ہیں۔ وہ چاہے تو آسانی سے ایک ساتھ تلاش کر سکتی ہے، لیکن شاید وہ لمحوں میں جینے کو زندگی نہیں سمجھتی۔ ہوٹل میں آنے والے ہر فرد کے لئے اس کی آنکھوں میں نفرت کی لکیریں اُبھرتی ہیں۔ خود اس کا باپ نریندر کپور مئے ناب کی مستیوں میں سرمست رہتا ہے۔

چوتھا ورق

اسکول جاتے ہی پال کا خط ملا۔ کتنا میٹھا اور پیارا ۔ ۔ ۔ اُس نے لکھا ہے ۔ ۔ ۔
"نلنی جب سے تم گئی ہو، یہاں ایک پل بھی چین سے نہیں گزرتا۔ مجھے تو بس اُس دن کا انتظار ہے جب ہماری مجبوریوں کا خاتمہ ہوگا اور ہمارے جیسے لوگوں کی مجبوریوں کا خاتمہ ہوگا۔ تم نے کنبے کا جو بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا ہے اُس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے اور میرے درمیان دوری ضرور ہے لیکن تم میرے قریب ہو۔ میں تمہاری آنکھوں

میں جھانک سکتا ہوں۔ تمہارے دل کی دھڑکنیں گن سکتا ہوں ۔ تمہارے ساتھ گزرے ہوئے لمحے یاد آتے ہیں تو آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ مدت ہوئی تم سے کوئی گیت سنے۔ جب جی بہت گھبراتا ہے تو اکثر وہ گیت یاد آتا ہے جو تم گنگناتی تھیں

میرے محبوب

جب محنت اور مزدوری کے دن بیت جائیں گے

تو وہی ہم تم ہوں گے اور وہی انار کے پھول

جن کی خوشبو میں ہماری محبت جوان ہوئی

پانچواں ورق

ریتا، اُس کا باپ نریندر کپور اور ہوٹل سپنا ایک مثلث ہے اور میں اس مثلث کو بہت کوشش کے بعد بھی جوڑ نہ سکی۔ ہوٹل کے ماحول سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ یہاں کی رنگینیوں میں بھی مجھے بے رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں اُبھرنے والے قہقہوں میں مجھے چیخوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں محبت کے نام پر سودا ہوتا ہے۔ نیکی کے نام پر بدنامی کا سکہ چلتا ہے۔ اس لئے دو ایک ٹیوشن کے لئے کوشش کرتی ہوں، اگر کامیاب ہوگئی تو بہت جلد ہوٹل کی پارٹ ٹائم نوکری چھوڑ دوں گی۔

پال کو آج ہی خط لکھا ہے۔ خط لکھتے وقت میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ پال تو ٹھیک ہی کہتا ہے

- - -

"You are an emotional fool"

چھٹا ورق

میں نے دیکھ لیا ہے، اس ہوٹل میں کئی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ میں اب ان لوگوں کی ہر حرکت ہر ادا کو پہچان سکتی ہوں۔ اکثر لوگ خود غرض اور دل پھینک ہیں۔ نہ جانے کیوں ہمارے معاشرے میں عورت کو ہر موڑ اور ہر سطح پر Sex symbol سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔

ساتواں ورق

کل میں نے فرصت کے کافی لمحے ریتا کے ساتھ بتائے۔ ریتا بہت باشعور ہے۔ کل اُس نے ہوٹل میں آنے والے چند لوگوں کی جو تصویر اُبھاری وہ کتنی صحیح ہے۔ ریتا کو انسانی نفسیات پر بے حد عبور حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ہوٹل کے ماحول سے بہت مانوس ہو چکی ہے۔ خود بھی تو ہوٹل ہی میں رہتی ہے۔ جب شام گئے اپنے بے آواز قدموں سے اُترتی ہے اور تاریکی کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں اور ہوٹل میں آکسٹرا کی لہر دوڑ جاتی ہے، چکنے سپید فرش پر جوان جسم تھرکنے لگتے ہیں تو وہ بالکونی میں آکر کافی کی چسکیاں لیتی ہوئی ماحول کی پرفریب سطح کو چیرتی جاتی ہے۔ اس پورے ماحول میں ریتا کو اگر کوئی شے پسند ہے تو وہ عبدل کی بے لوث اور بے داغ مسکان۔

آٹھواں ورق

ہوٹل کی زندگی سے اب واقعی اُکتانے لگی ہوں۔ یہاں ایسے کتنے لوگ آتے ہیں جو بظاہر خوبصورت ہیں، جن کے لباس خوبصورت ہیں، رنگ روپ خوبصورت ہیں، لیکن خود وہ ۔ ۔ ۔ کاش! وقت کی ستم ظریفیاں مجھے یہاں نہ لے آتیں۔ میں نے ٹھیک ہی کیا، پال اور

میں جھانک سکتا ہوں۔ تمہارے دل کی دھڑکنیں گن سکتا ہوں ۔ تمہارے ساتھ گزرے ہوئے لمحے یاد آتے ہیں تو آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ مدت ہوئی تم سے کوئی گیت سنے۔ جب جی بہت گھبراتا ہے تو اکثر وہ گیت یاد آتا ہے جو تم گنگناتی تھیں ۔

میرے محبوب

جب محنت اور مزدوری کے دن بیت جائیں گے

تو وہی ہم تم ہوں گے اور وہی انار کے پھول

جن کی خوشبو میں ہماری محبت جوان ہوئی

پانچواں ورق

ریتا، اُس کا باپ نریندر کپور اور ہوٹل سپنا ایک مثلث ہے اور میں اس مثلث کو بہت کوشش کے بعد بھی جوڑ نہ سکی۔ ہوٹل کے ماحول سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ یہاں کی رنگینیوں میں بھی مجھے بے رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں اُبھرنے والے قہقہوں میں مجھے چیخوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں محبت کے نام پر سودا ہوتا ہے۔ نیکی کے نام پر بدنامی کا سکہ چلتا ہے۔ اس لئے دو ایک ٹیوشن کے لئے کوشش کرتی ہوں، اگر کامیاب ہوگئی تو بہت جلد ہوٹل کی پارٹ ٹائم نوکری چھوڑ دوں گی۔

پال کو آج ہی خط لکھا ہے۔ خط لکھتے وقت میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ پال تو ٹھیک ہی کہتا ہے ۔ ۔ ۔

"You are an emotional fool"

چھٹاورق

میں نے دیکھ لیا ہے، اس ہوٹل میں کئی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ میں اب ان لوگوں کی ہر حرکت ہر ادا کو پہچان سکتی ہوں۔ اکثر لوگ خود غرض اور دل پھینک ہیں۔ نہ جانے کیوں ہمارے معاشرے میں عورت کو ہر موڑ اور ہر سطح پر Sex symbol سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔

ساتواں ورق

کل میں نے فرصت کے کافی لمحے ریتا کے ساتھ بتائے۔ ریتا بہت باشعور ہے۔ کل اُس نے ہوٹل میں آنے والے چند لوگوں کی جو تصویر اُبھاری وہ کتنی صحیح ہے۔ ریتا کو انسانی نفسیات پر بے حد عبور حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ہوٹل کے ماحول سے بہت مانوس ہو چکی ہے۔ خود بھی تو ہوٹل ہی میں رہتی ہے۔ جب شام گئے اپنے بے آواز قدموں سے اُترتی ہے اور تاریکی کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں اور ہوٹل میں آکسٹرا کی لہر دوڑ جاتی ہے، چکنے سپید فرش پر جوان جسم تھر کنے لگتے ہیں تو وہ بالکونی میں آکر کافی کی چسکیاں لیتی ہوئی ماحول کی پر فریب سطح کو چیرتی جاتی ہے۔ اس پورے ماحول میں ریتا کو اگر کوئی شے پسند ہے تو وہ عبدل کی بے لوث اور بے داغ مسکان۔

آٹھواں ورق

ہوٹل کی زندگی سے اب واقعی اُکتانے لگی ہوں۔ یہاں ایسے کتنے لوگ آتے ہیں جو بظاہر خوبصورت ہیں، جن کے لباس خوبصورت ہیں، رنگ روپ خوبصورت ہیں، لیکن خود وہ ۔ ۔ ۔ کاش! وقت کی ستم ظریفیاں مجھے یہاں نہ لے آتیں۔ میں نے ٹھیک ہی کیا، پال اور

ممی کو ہوٹل کی پارٹ ٹائم نوکری کے بارے میں کچھ نہ بتایا، کچھ نہ لکھا ۔ ۔ ۔ کاؤنٹر پر بات کرتے ہوئے کندن نے کل رات میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بازاری انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ہوٹل کے مالک کا دوست جو ہوا ۔ ۔ کتنا اذیت ناک لمحہ تھا وہ میرے لئے ۔ ۔ ۔ اور بھی کتنے لوگ آتے ہیں۔ یہاں ایک مدن لال جی ہیں۔ روز اپنی بیوی کے ساتھ آتے ہیں۔ بہت زیادہ پینے کے بعد جب مدہوش ہو جاتے ہیں تو اُنہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ اُن کی بیوی کو کون لے اُڑا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جان بوجھ کر مدہوشی کا لباس اوڑھ لیتے ہیں۔ اُن کی بیوی کاروبار کے پھیلاؤ کا ایک بڑا ذریعہ ہے نا ۔ ۔ ۔ !

ایک مسز کبیر ہیں جو ہر شام بالوں کے نئے نئے فیشن کے بارے میں بتا کر اپنے ساتھیوں کو بور کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ شراب کی چسکیاں لے کر خوشبو کی مختلف قسموں کے بارے میں باتیں کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ایوننگ اِن پیرس کی باتیں۔ ریتا کہتی ہے کہ مسٹر کبیر کسی جنگ میں کام آگئے اور جبھی سے مسز کبیر اُن کے غم میں شراب پیتی ہے۔ اچھا بہانہ ہے دل بہلانے کا ۔ ۔ !

راج ایڈوانی شاید دلی کی ہے اور یہاں میڈیکل پڑھ رہی ہے۔ گھر والے سمجھتے ہوں گے کہ چند برسوں بعد لڑکی ڈاکٹر بن کر آئے گی، لوگوں کی سیوا کرے گی، بیماروں کو شفا بخشے گی اور بیٹی یہاں سپنا کے رنگین ماحول میں گم ہو چکی ہے۔ جواں اور صحت مند جسم اس کے آس پاس بیماروں کا روپ لئے گھومتے رہتے ہیں ۔ ۔ وھسکی پیتی ہے، نوٹ سرکتے ہیں، نگاہوں کی زبان سے باتیں ہوتی ہیں اور پھر راتیں گناہ آلود ہو جاتی ہیں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ اندھی بن جاتی ہوں۔

کس کس کا، کن کن کا ذکر کروں۔ اپنے احمد سرفروش ہیں۔ سنا ہے لبرٹی کی کیبرے ڈانسر پر ہزاروں لٹا چکے ہیں اور سب کچھ لٹا کر اب یہاں آنے لگے ہیں۔ ایک شام مجھے بھی ڈرنک آفر کی تھی۔ میرے کہنے پر کہ میں شراب نہیں پیتی، وہ حیران رہ گیا تھا۔ کم بخت کو کتنے پیارے پیارے شعر زبانی یاد ہیں۔

اُس ٹھیکے دار کا نہ جانے کیا نام ہے جس کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے داغ ہیں اور ہمیشہ علی یوسف، مسز یوسف علی اور شفیقہ علی کے ٹیبل کے سامنے بیٹھا رہتا ہے۔ دراصل اس کی نظریں شفیقہ پر ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ یوسف میاں سے کہہ دوں کہ وہ شفیقہ کو ساتھ نہ لایا کریں۔ پھر میں نے سوچا بھلا مجھے کیا۔

سہراب جی سے کون واقف نہیں۔ شہر کے چند بڑے آدمیوں میں سے ہیں۔ ہمیشہ اپنی بہو رانی کے ساتھ آتے ہیں۔ بہو رانی ہمیشہ کسی نہ کسی گیت کی فرمائش کرتی رہتی ہے۔ ان کے بارے میں سنا ہے ایڈنا ان کی بیوی بنتے بنتے ان کی بہو بن گئی۔۔۔ کیسے کیسے رنگ ہیں اس کائنات کے۔

اور ریتا کا باپ نریندر کپور۔۔۔ اس کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ اس کی ہوس کی کوئی حد نہیں۔ اتنی ساری دولت کا کرے گا کیا؟ ریتا وہ سب کچھ جانتی ہے لیکن خاموش ہے۔۔۔ میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ سوچنے کا کیا ادھیکار ہے۔ یہ سب تو ہمارے سماج کے ذمہ دار رُکن ہیں۔ یہ سب اگر سماج کو پستیوں کی طرف لے جانے میں مصروف ہیں تو کیا میں اکیلی تنہا سماج کو بلندیوں کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو سکتی ہوں؟

نواں ورق

آج میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ اسکول بھی نہ گئی اور ہوٹل سے بھی رخصت لے لی۔ ابھی ابھی کافی پی اور اب تھوڑی سی بشاشت محسوس ہو رہی ہے۔ ممی کی صحت بھی اب اچھی نہیں رہتی۔ اُنہیں میری ضرورت ہے لیکن میری ضرورتوں کا حساب کون رکھے گا؟

دسواں ورق

ریتا آج کل بہت غمگین رہتی ہے۔ کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس ذہنی پریشانی میں وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھے۔ وہ زندگی سے جیسے مایوس ہو چکی ہے۔ میں نے اُسے اپنی کہانی سنائی، زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ کہنے لگی، اگر زندہ ہی رہنا ہے تو اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں اس کی کوئی آواز نہیں، کوئی قدر نہیں، محبت اور پیار نہیں، خلوص کا ایک کتابی لفظ تک نہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگی، دیدی! کیا تم مجھے سہارا نہیں دے سکتیں؟ میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو خود اپنی زندگی میں بے سہارا ہو، وہ دوسروں کا سہارا کیسے بن سکتی ہے؟

کہنے لگی ۔ ۔ ’’تمہاری دنیا میں شراب کے یہ جام تو نہ ہوں گے، یہ ملمع چڑھائے ہوئے بے نور چہرے تو نہ ہوں گے، محبت کی کوئی کرن، ہمدردی کا کوئی لفظ تو ہوگا۔ بس مجھے یہی چاہیئے‘‘ ۔ ۔ ریتا میں تمہارا سہارا بنوں گی۔

گیارہواں ورق

میں نے پال کو ایک طویل خط لکھا ہے۔ ریتا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے لکھ دیا کہ اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی ریتا کو لے کر آ رہی ہوں۔

بارہواں ورق

ریتا بے حد اُداس ہے۔ کئی بار کرید نے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی نہیں بولتی۔ اس کی یہ خاموشی ۔ ۔ ۔ اس کے سینے میں چھپا ہوا خاموش ساگرا گر بپھر گیا تو ۔ ۔ ۔ ؟

آخری ورق

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس میں ریتا کا کوئی قصور نہیں۔ ہوٹل کے ایک معمولی ویٹر عبدل کو جیون ساتھی چننے کی اس کی ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

اس ہوٹل کے پورے ماحول میں اگر کوئی چیز مجھے متاثر کرتی ہے تو وہ ہے عبدل کی بے لوث اور بے داغ مسکان ۔ ۔ ۔ !!

کشمیر کہانی

''درد ہو رہا ہے؟'' ۔ ۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں تو''

''تو پھر خاموش کیوں ہو؟''

''سوچ رہا ہوں ڈاکٹر''

''کیا ۔ ۔ ؟''

''ڈاکٹر سوچ رہا ہوں، انجکشن لگا کر آپ نے میرے جسم کے اُس حصے کو بے حس کر دیا ہے جہاں آپ سرجری کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں''

''وہ تو ہے''

''اس سرجری کے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا، میرا زخم بھی بھر جائے گا، میں چل پھر سکوں گا، دیکھ سکوں گا، بول سکوں گا، روزی روٹی کما سکوں گا، لیکن ۔ ۔ ۔ !''

''لیکن کیا؟''

''اُن کا کیا ہوگا ڈاکٹر، جن کے صحت مند جسم کی صحت مند آنکھیں پیلٹ کے مہلک اثرات سے بے نور ہو چکی ہیں، بینائی کھو چکی ہیں اور اب عمر بھر خون کے آنسو روتی رہیں گی ۔ ۔ ۔ ہاں ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ آپ خاموش کیوں ہیں، کچھ تو بولئے نا ۔ ۔ ۔!''

گھر کی بات

گھر کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ بٹوہ اُس کی جیب میں نہیں ہے اور کل دن بھر کی ساری بالائی کمائی بٹوے میں ہی رہ گئی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ صبح اپنی پولیس کی وردی پہنتے ہوئے وہ اپنا بٹوہ کل والی پتلون کی جیب سے نکالنا بھول گیا ہوگا۔ وہ دوبارہ گھر کے اندر لوٹ آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا نوٹوں سے بھرا بٹوہ اس کی بیوی مار چکی ہے اور وہ نئے نئے نوٹ گننے میں مصروف ہے۔

''خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔ میں چوری کے الزام میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں''

''یہ لیجئے'' ۔ ۔ بیوی نے ہنستے ہوئے سوسو کے پانچ نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے رشوت دے رہی ہو''

''ہاں اور معاملہ رفع دفع کیجئے۔ رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کرنا آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ تو روز کا معمول ہے۔ آپ ہی کی رشوت کی رقم سے سوسو کے پانچ نوٹ آپ کے ۔ ۔ !''

''اور باقی رقم ۔ ۔ اچھی خاصی رقم تھی بٹوے میں''

''باقی رقم میری ۔ ۔ چور کو بھی اس کا حق ملنا چاہیے ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ؟''

''اور کیا؟''

''اور پھر یہ تو گھر کی بات ہے۔ گھر کی بات باہر نہ جائے تو بہتر ہے''

خاندانی روایت

''بڑا مزے دار حلوہ بناتے ہیں آپ ۔ ۔ ۔ گاجر کا حلوہ'' شاعر نے کہا۔

''صاحب ایسا مزے دار میٹھا گاجر کا حلوہ کہیں اور نہیں ملے گا آپ کو'' ۔ ۔ ریسٹوران کے مالک نے شاعر کا دل جیتنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک پلیٹ اور دیجئے گا''

''لیکن آپ تو دو پلیٹ حلوہ لے چکے ہیں''

''بھائی صاحب! غزلیں بھی تو تین سنا چکا ہوں''

''جانتا ہوں کہ آپ شاعر ہیں۔ آپ کی غزلیں بھی سن چکا ہوں، لیکن حیرانی ہو رہی ہے''

''حیرانی کیوں ۔ ۔ ؟ کس بات کے لئے ۔ ۔ ؟'' شاعر نے جاننا چاہا۔

''شاعری کا گاجر کے حلوہ کے ساتھ کیا تعلق ۔ ۔ ؟''

''تعلق ہے۔ اسی لئے تو بتا رہا ہوں''

''تو بتایئے نا'' ۔ ۔ مالک ریسٹوران نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

''بتادوں گا میرے محسن، میرے دوست۔ پہلے گاجر کا حلوہ تو کھانے دیجئے''

''ویٹر ۔ ۔ شاعر صاحب کے لئے ایک اور گاجر کا حلوہ ۔ ۔ گرم گرم''

شاعر صاحب گاجر کا حلوہ کھاتے رہے اور اپنی غزل کے شعر بھی گنگناتے رہے اور پھر اپنی

بیاض بند کرنے کے بعد کہا۔

''کتنا بنا ۔ ۔ ؟''

''زیادہ نہیں، صرف ایک سو ستر روپے''

''صرف ایک سو ستر روپے، لیکن میرے تو دو سو بنتے ہیں''

''دو سو روپے آپ کے ۔ ۔ کیسے ۔ ۔ میں نے آپ سے کچھ بھی تو نہیں لیا''

''بھائی صاحب میرے پاس ہے ہی کیا جو آپ لیتے ۔ ۔ لیکن ۔ ۔!''

''لیکن کیا ۔ ۔ ؟''

''جناب چار غزلیں سنا چکا ہوں۔ فی غزل پچاس روپے معاوضہ لیتا ہوں۔ اس طرح سے میرے دو سو روپے بنتے ہیں اور آپ کے ایک سو ستر ۔ ۔ باقی تیس روپے''

''کمال ہے صاحب تین پلیٹ ہضم کرنے کے بعد اب مجھے ہی جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا''

''آپ سے کون لے رہا ہے۔ وہ تو میں آپ ہی کو دے رہا ہوں۔ میری جانب سے رکھ لیجئے۔ ٹپ دینا ہماری خاندانی روایت ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھئے گا ۔ ۔ شکریہ!''

وہیل چیئر

صاف وشفاف یک رنگی دیواریں، ہلکی نیلی سیلنگ اور اُس پر ستاروں کی شکل میں لٹکے انمول جھاڑ جیسے آسمان کی وسعتوں میں جھلملاتے ستارے، دروازوں اور کھڑکیوں پر اسی شیڈ کے ریشمی پردے، مغربی گوشے میں سجا ہوا اسی رنگ سے ملتا جلتا قیمتی صوفہ سیٹ، بلوریں فرش پر بچھا بڑھیا کوالٹی کا یارقندی قالین اور اُس پر کڑھے ہوئے قوس وقزح کے رنگوں میں بنے گل بوٹے۔ دیواروں پر لٹکی مشہور ومعرف مصوروں کی بنائی شاہکار تصویریں اور نیوڈس۔ اُس طرف دیدہ زیب ویڈیو گرام اور اس طرف دل لبھانے والا پیانو۔ چنار کی لکڑی سے بنے بڑے سے میز پر کئی طرح کے قیمتی مشروب، قرینے سے سجی ہوئیں بوتلیں، منقشی گلدان میں رکھے تازہ مشک آفریں گلاب اور پاس ہی پڑی ویل چیر

سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھلتے کنول کے پھول نظروں کو فرحت بخشتے ہیں۔ ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں گھوم پھر جاتی ہیں۔ ڈوبتے اُگتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے۔ خاموش راتوں کی چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں۔

دامن کوہ میں کھڑی یہ میری کوٹھی کا ایک تنہا گوشہ ہے!

یہ میری جنت ہے!!

''کتنی خوبصورت شام ہے آج، میں ضرور جیتوں گی''

میرے ہاتھ میں تاش کے تین پتے ہیں اور میرے سامنے تین عورتیں بیٹھی ہیں ۔۔ مسز سونی، ثریا اور صفیہ ۔۔ !

''آپ کب نہیں جیتیں ۔۔ مسز سونی'' میں ایک خفیف سی مسکان ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہتا ہوں ۔۔ وہ مسکرا رہی ہے اور میں اپنی بیوی صفیہ کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ صفیہ کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا احتجاج ہے۔

''بس بھی کیجئے اب '' ۔۔ صفیہ کہتی ہے۔

''نہیں ابھی نہیں۔ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے'' ۔۔ مسز سونی کہتی ہے۔

''لیکن ۔۔ لیکن میرا کھیل تو کب کا ختم ہو چکا ہے''

''اب آپ کی باری ہے'' ۔۔ ثریا کہتی ہے۔

''بڑی بے قرار نظر آ رہی ہو'' ۔۔ صفیہ پوچھتی ہے۔

ثریا صفیہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ میں ثریا کی طرف دیکھتا ہوں اور مجھے چنار کا وہ درخت یاد آتا ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ثریا اور میں نے نہ جانے کتنی بار گڑے گڑیوں کے بیاہ رچائے تھے، مٹی کے گھروندے بنائے تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے عمروں کا حصہ بیت گیا اور ایک دُبلی پتلی سی پیاری پیاری سی لڑکی ایک جوان سراپا میں بدل گئی۔ ہم دونوں نے مل جل کر محبت کی قندیلوں سے جگمگاتے گھر کا خواب دیکھا۔ میرے دل کے ویران بنجر میں پہلا پھول کھلا اور اس کی خوشبو ہر سمت پھیل گئی اور میں ایک مدھر مدھر رس دار خوشبو کی دنیا میں کھویا رہا۔ کتنی ہی دیر کھویا رہا۔ جب آنکھ کھل گئی تو خواب ٹوٹ چکے تھے۔ میرے سینے پر لٹکی

ہوئی میری انجینئرنگ کی ڈگریاں تھیں اور میں بے کار تھا۔ ثریا کو اپنانے کے لئے مجھے کام کی ضرورت تھی، نوکری کی ضرورت تھی۔ "No Vacancy" کے بورڈ میرا منہ چڑا رہے تھے۔

''چلئے کیا سوچ رہے ہیں آپ'' ۔ ۔ ۔ مسز سونی کہتی ہے۔

''میں ڈاؤن ہو جاتی ہوں'' ۔ ۔ ۔ صفیہ بڑی بے تابی سے پتے پھینک دیتی ہے۔

''اور آپ ۔ ۔ ۔'' میں ثریا کی طرف دیکھتا ہوں۔

''میں تو اُن میں سے ہوں جو جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاتے ہیں'' وہ بے حد اُداس لہجے میں کہتی ہے۔

میں پتے پھینک دیتا ہوں اور مسز سونی نے ایک بار پھر روپے سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ہنس رہی ہے اور پھر تاش بانٹنے لگتی ہے۔ ثریا نے پتے اُٹھائے دیکھا اور پھینک دیئے۔ صفیہ نے بھی بڑی بے دلی کے ساتھ پتے پھینک دیئے ہیں۔

''اس بار آپ ضرور جیتیں گے، چال چلئے'' ۔ ۔ ۔ مسز سونی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔

کوٹھی کے اس تنہا گوشے کو حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنی زندگی کو ایک بہت بڑے داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس بازی میں مجھے نوکری ملی اور صفیہ بھی۔ میری بیوی کے روپ میں صفیہ کے والد اپنے زمانے کے مانے ہوئے انجینئر تھے۔ حال حال ہی میں چل بسے ہیں۔ اُنہیں ایک لڑکے کی ضرورت تھی اپنی بیٹی کے لئے۔ ایک گھر داماد کی ضرورت تھی اپنی جائیداد کی رکھوالی کے لئے۔ لڑکے تو کئی مل سکتے تھے۔ گھر داماد بھی مل سکتے تھے جو اپنے ساتھ مال وحشمت بھی لا سکتے تھے۔ لیکن انجینئر صاحب کو ایک ایسے لڑکے کی ضرورت تھی جو اُن کی بن ٹانگوں کی اکلوتی بیٹی صفیہ کو اپنا بھی لے اور اُس کی تابعداری بھی کر سکے۔ وہ جانتے تھے کہ

دولت سب کچھ کر سکتی ہے، سب کچھ خرید سکتی ہے۔ اُنہوں نے مجھے خرید لیا اور میں نے دولت سے سودا کر لیا۔ صفیہ کی ٹانگیں ایک حادثہ کا شکار ہو چکی ہیں۔ ایک وہیل چیئر کے ساتھ ہی چل پھر سکتی ہے۔ صفیہ کو اپناتے ہی مجھے نوکری مل گئی اور میرے سینے پر لٹکی ہوئی انجینئرنگ کی ڈگریاں مجھے ایک نئے راستے پر لے گئیں۔ مجھے نوکری ملی، دولت ملی، کوٹھی ملی، صفیہ ملی ۔ ۔ ۔ اس نئے راستے کو اپنا کر مجھے میرے سامنے بیٹھی ہوئی ثریا کو کھونا پڑا ۔

۔ کیا سچ مچ یہ حشمت، یہ دولت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے ۔ ۔ ؟

''چال چلئے نا''

''ڈبل چال چلتا ہوں''

''نوٹ پرانے ہیں''

''نئے بھی آپ کے لئے ہی رکھے ہیں'' میں سامنے رکھے نئے نوٹ آگے سرکا دیتا ہوں۔

''پتے دیکھ لیجئے نا'' ۔ ۔ صفیہ کہتی ہے۔

''کھیلنے دیجئے'' مسز سونی میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

صفیہ ریسیور اُٹھاتی ہے ۔ ۔ ''ہیلو ۔ ۔ جی ہاں ہیں ۔ ۔ مسز سونی آپ کا فون''

ریسیور اب مسز سونی کے ہاتھ میں ہے ۔ ۔ '' ہیلو ۔ ۔ ہاں ہاں بول رہی ہوں۔ تم کب آئے، ہاں ہاں مجھے یاد ہے، بات کر لوں گی۔ ابھی تو ہم تاش کے پتوں سے دل بہلا رہے ہیں''

مسز سونی ریسیور رکھ دیتی ہے۔

''کون تھے ۔ ۔ ؟'' صفیہ پوچھتی ہے۔

"سونی تھے۔ اب انہیں اپنے بزنس کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ اب دیکھئے نا، کہہ رہے تھے کہ کنٹریکٹ کی فائل پر آج ہی دستخط ہوں"

میں جانتا ہوں مسز سونی کے یہاں آنے، تاش کے پتوں سے دل بہلانے اور پیار بھری نظروں سے دیکھنے کا کیا مطلب ہے۔ میرا ایک دستخط اور لاکھوں کا فائدہ۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم کس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم کس سماج اور کسی سوسائٹی کی تخلیق کررہے ہیں۔ یہاں ہر شئے میں بناوٹ ہے، ملاوٹ ہے۔ ہماری باتیں ہماری سوچیں سبھی تو نقلی ہیں۔ ان پر ملمع چڑھا ہوا ہے ۔ ۔ !

میں ایک چال چلتا ہوں اور مسز سونی ڈبل کرلیتی ہے۔ میں پتے دیکھے بغیر ہی ڈاؤن ہوجاتا ہوں۔ مسز سونی چکنے چکنے نوٹ سنبھال رہی ہے۔ صفیہ حیران حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ صفیہ کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں اور وہ وہیل چیئر کے سہارے اُس کھڑکی کی جانب جارہی ہے جہاں سے آدھے چاند کا نظارہ ایک عجیب سماں باندھ رہا ہے۔

میں مسز سونی سے کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ "میں چاہتا تو یہ بازی جیت سکتا تھا"

"آپ ہمیشہ جیت سکتے ہیں، تاش کی بازی ہی نہیں بلکہ ۔ ۔ "

مسز سونی کھڑی ہوجاتی ہے اور ایک ڈرنک بنا کرلاتی ہے، میری طرف بڑھاتی ہے اور میں ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرلیتا ہوں۔ مسز سونی کی طرف دیکھتا ہوں۔ اُس نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگالیا ہے ۔ ۔ میں سوچتا ہوں اگر میری شادی ثریا سے ہوئی ہوتی تو میری کائنات کچھ اور ہی ہوتی اور میرے جینے کا ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتا ۔ ۔ شاید یہ شراب نہ ہوتی، یہ گہما گہمی نہ ہوتی، یہ ہنگامے نہ ہوتے، یہ رنگینی نہ ہوتی۔ ایک خاموش

خاموش سی زندگی ہوتی ۔ ۔ اور اگر میں نہ ہوتا، ٹھیکے دار اوم سونی ہوتا تو کیا میری بیوی بھی ایسے ہی کس بڑے انجینئر کے سامنے ایسی ہی پرمعنی باتیں کرتی۔ یوں ہی اپنے جسم کی نمائش کرتی اور ایسے ہی ۔ ۔ ۔ !

صفیہ واپس آچکی ہے!

''ثریا ایک بات پوچھوں'' ۔ ۔ صفیہ ثریا سے کہہ رہی ہے اور میں دونوں کی باتیں سن رہا ہوں۔

''ہاں کہو''

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتی''

ثریا کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اُس کی آنکھیں مجھ سے اس سوال کا جواب پوچھ رہی ہیں۔ میں اپنی پلکیں جھکا لیتا ہوں۔

''کہو ثریا''

''میں اب چلتی ہوں''

''سنو ثریا ۔ ۔ سنو ۔ ۔ رُک جاؤ''

میں اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھتا ہوں، ثریا چلی گئی ہے۔ مسز سونی میرے لئے ایک اور ڈرنک بنا رہی ہے ۔ ۔ ''

ثریا تو ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔ اُس کا قاتل میں ہوں۔ ہاں میں۔ میں نے ہی اُس کے خوابوں پر سیاہی پوت دی ہے۔ اور یہ لاش آج بھی اپنی تنہائی کی سزا کاٹ رہی ہے ۔ ۔ !

''یہ لیجئے''

شراب اب آہستہ آہستہ مجھ پر اثر کر رہی ہے۔ میری آنکھوں میں آگ سی لگی ہے اور اس میں

مسز سونی کا جسم پگھلنے لگا ہے!

''ڈبل''

''ڈبل''

''چار گنا''

''آٹھ گنا''

''کیا آپ پھر جیت رہی ہیں''

''نہیں اب میرے ہارنے کی باری ہے''

''تو سمیٹ لو''

''کیا''

''بازی''

''میں سمجھی تھی کچھ اور ۔ ۔'' اُس نے اپنا پرانا جملہ دہرایا اور اس کے ساتھ ہی مسکرا کر ایک بھرپور انگڑائی لی ہے۔ سینے پر پڑا اس کا ڈوپٹہ سرک گیا ہے۔ جانے یہ شراب کا اثر ہے یا مسز سونی کے عریاں جسم کا کہ میں اپنے اندر ایک عجیب سی تپش محسوس کر رہا ہوں۔

''بہت کھیل چکے اب تو'' صفیہ کہتی ہے۔

''تاش بانٹئے نا ۔ ۔'' مسز سونی صفیہ کی کہی ہوئی بات کو اَن سنی کر دیتی ہے۔

''میں جا رہی ہوں'' ۔ ۔ اور صفیہ آہستہ آہستہ وہیل چیر کے سہارے کمرے سے باہر جا رہی ہے۔

''کبھی کبھی مجھے اس پر بے حد رحم آتا ہے''

''بے چاری''

''کیا ہوا''

''کچھ نہیں ۔ ۔ شروع کیجئے نا''

''تاش یا کچھ اور''

میں گھور کر دیکھتا ہوں ۔ ۔ مسز سونی کی مسکان۔ اُس کا شباب اور شراب کا نشہ اور میں ایک بڑی چال چلتا ہوں۔

وہیل چیر کی آواز آرہی ہے۔ شاید صفیہ کا دل وہاں نہیں لگا۔ شاید اُس نے کسی پنچھی کو دام میں پھنستے دیکھا۔

''کون جیتا'' ۔ ۔ وہ جاننا چاہتی ہے۔

''وہی جو لگاتار ہار رہا تھا''

رات کافی ہو چکی ہے۔ میں مسز سونی کو چھوڑنے کے لئے نیچے آگیا ہوں۔ دفعتاً اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ میرے سارے شریر میں آگ لگی ہے۔ آدھے چاند کی رات، اور تنہائی ؟، خاموشی ہے اور نشہ بھی۔ وقت کی رفتار رُک جاتی ہے اور پھر مسز سونی فائل میری طرف بڑھاتی ہے اور میں بغیر سوچے، بغیر دیکھے اُس پر دستخط کر لیتا ہوں۔

میں اب اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا ہوں !

وہیل چیر خالی پڑی ہے۔ کیا صفیہ کو ٹانگیں واپس مل چکی ہیں۔ کیا وہ وہیل چیر کے سہارے کے بغیر ہی چلنے لگی ہے۔ میں گھبرا رہا ہوں اور حیران بھی ہو رہا ہوں۔ لیکن نہیں وہ بستر پر بے سدھ پڑی ہے۔ میری نگاہیں ایک بار پھر وہیل چیئر کی طرف اُٹھتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا مجھے بھی ایک وہیل چیئر کی ضرورت نہیں۔ کیا میں مفلوج نہیں ہو چکا ہوں۔ ذہن میں عجیب سی کشمکش ہے۔ جانے کیا سوچ رہا ہوں۔ میری ان سوچوں کی کوئی سرحد نہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں ابھی گر جاؤں گا۔ جیسے میری ٹانگیں اچانک کٹ چکی ہوں اور میں غیر ارادی طور پر وہیل چیئر پر بیٹھ جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ !!

دو گز زمین

سرحد کے اُس پار سے اس پار بلا جواز فائرنگ کے نتیجے میں دس افراد جن میں تین عورتیں اور دو بچے شامل ہیں، مارے گئے۔ بارہ لوگ زخمی ہونے کی بھی اطلاع ہے۔ زخمیوں کو علاج ومعالجہ کے لئے نزدیکی ہسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔ دو کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ سات مکانوں کو جزوی طور پر نقصان ہوا ہے۔ لوگ خوف زدہ ہوکر اپنی بستی اور اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ۔ ۔ (ایک اخباری خبر)

سرحد کے اِس پار سے اُس پار جو بلا جواز فائرنگ کی گئی، اُس کے نتیجے میں نہ صرف آٹھ افراد جاں بحق ہوئے بلکہ دو گاؤ خانے اور تین مکان بھی بارود کی زد میں آ گئے۔ مرنے والوں میں دو خواتین اور دو بچے بھی شامل ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بارہ ہے جن میں کئی ایک کی حالت بہت زیادہ نازک بتائی جاتی ہے۔ خوف وہراس کی وجہ سے لوگ اپنی بستی اور مال وجائیداد کو چھوڑ کر آس پاس کے گاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

۔ ۔ (ایک اخباری خبر)

سرحد کی لکیر اپنی جگہ قائم ودائم ہے لیکن اس کے آر پار کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ فائرنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہلاکتیں ہو رہی ہیں، زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ

اپنے گھروں سے بے گھر ہو رہے ہیں۔ پناہ کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ فائرنگ کو روکنے اور امن وامان قائم کرنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں۔ جنگ بندی پر زور دیا جا رہا ہے۔ فوجیوں کو امن وشانتی سے کام لینے کے لئے پُرزور اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ امن میٹنگ منعقد کرنے کی تجویز بھی زیرِ غور ہے اور یہ جاننے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ آخر اس فائرنگ کی وجہ کیا ہے۔ اس کا آغاز کب، کیسے اور کہاں سے ہوا۔ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ ابتدا اِدھر سے ہوئی یا اُدھر سے، لیکن یہ وقت ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے کا نہیں ہے بلکہ حالات کو بہتر بنانے اور جذبات پر قابو رکھنے کا وقت ہے۔ اس آگ کو بجھانے کی ضرورت ہے جو اب تک زندگی کے آئینے میں پوشیدہ تھی اور اب جل جل کر ہر شے کو راکھ کر رہی ہے اور اس راکھ سے جو دُھواں اُٹھ رہا ہے وہ فضاؤں کو اپنی کہر آلود آغوش میں سمیٹ رہا ہے۔ ۔ ۔ (ایک اخباری تجزیہ)

نو دن کی مسلسل فائرنگ کے بعد اب سرحد کے دونوں اطراف خاموشی چھا گئی ہے۔ لگتا ہے کہ جنگ بندی کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان نو دنوں میں تیس سے زائد انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے۔ ان میں سے کئی ایک کی جسمانی حالت اب بھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ دس ہزار سے زائد لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ خوف ودہشت کی وجہ سے اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور اب دوسری بستیوں میں انتہائی نامناسب حالات میں رہ رہے ہیں۔

اس چھوٹی سی لکیر جسے عام زبان میں سرحد کہتے ہیں، کے آر پار سب کچھ ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔ موسم ایک جیسے ہیں۔ ان کے رنگ اور ان کے نام ایک جیسے ہیں۔ پھول ایک جیسے ہیں۔ ان کی خوشبو، ان کی مہک ایک جیسی ہے۔ کھیت ایک جیسے ہیں۔ ان میں اُگنے والا اناج

ہم سب کی من پسند خوراک ہے۔ پہاڑ ایک جیسے ہیں۔ برف اور پانی ایک جیسے ہیں۔ جھیل، جھرنے اور ندی نالے ایک جیسے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو آر پار ایک جیسی روشنی پھیل جاتی ہے۔ جب چاندنی بکھرنے لگتی ہے تو اس پار بھی حبہ خاتون کے رسیلے گیت سنائی دیتے ہیں۔ آنکھوں کا کاجل، ہاتھوں کی مہندی اور کلائیوں کی چوڑیاں بھی تو ایک جیسی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ انسان بھی ایک جیسے ہیں۔ ان کے خدوخال ملتے جلتے ہیں۔ ان کی بول چال اور زبانیں ایک جیسی ہیں، ان کی تہذیب اور ان کی تاریخ ۔ ۔ ۔ کئی صدیوں پر مبنی تاریخ ایک جیسی ہے۔ تو پھر اتنی ساری نزدیکیاں دوریوں میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوتی جارہی ہیں؟ کیوں ہم اپنے ہی لہو سے دھرتی کو سیراب کررہے ہیں؟ دھرتی سے آکاش تک دھند میں لپٹے ہوئے ان گنت مناظر ہماری آنکھوں میں کیوں نشتر چبھوتے ہیں آخر کیوں؟ ۔ ۔ (اخباری اداریہ)

میں اخبار کا مدیر ہوں۔ ان اخباری تراشوں کو ترتیب دیتے وقت میرے کانوں میں ایک آواز گونج رہی ہے۔ جانے یہ آواز کس کی ہے۔ میری اپنی ۔ ۔ نہیں یہ میری آواز نہیں ہے۔ میری آواز میں اتنی قوت نہیں۔ اتنی شدت نہیں۔ زورِ طوفان بھی نہیں ہے۔ پھر یہ آواز ۔ ۔ ٹھہر ٹھہر کر اُبھرنے والی اس آواز میں مجھے لگتا ہے کہ فرمانِ الٰہی پوشیدہ ہے ۔ ۔ ۔

''ایک انسان کا دوسرے انسان کو قتل کرنا سب سے بڑا فتنہ اور حرام ہے۔ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے ۔ ۔ ۔ !''

''اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ پھر بھی یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے اور کس لئے ہورہا ہے۔ صرف دو گز زمین کے لئے ۔ ۔ !'' ۔ ۔ (مدیر)

جگنو

اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر لئے معصوم سے بچوں کے اس بے پناہ ہجوم میں، میں اپنے بچے کو تلاش کر رہا ہوں، لیکن مجھے میرا بچہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں ہجوم کے قریب آتا ہوں اور بچوں کے ہجوم میں اپنے بچے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اب بھی اپنا بچہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید یہ ایک ہجوم نہیں ایک ننھی سی چھوٹی سی دھرتی ہے۔ گونگے کھنڈروں سے اُبھرنے والی ایک گونجتی گرجتی بستی ہے۔ چھت کی صورت میں ان بچوں کے سروں پر ان کی حفاظت اور سلامتی کے لئے سائبان کی صورت میں ایک چھوٹا سا آسمان بھی ہے۔ اب میں بچوں کے بہت قریب آ کر اس ہجوم کا ایک حصہ بن رہا ہوں اور ان بچوں کو بولتے ہنستے دیکھ رہا ہوں۔ ان کی کہی اَن کہی کو محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا میری آنکھوں کی بینائی بجھ چکی ہے؟ احساس کی شبنمی تپش میرے وجود کو ڈس چکی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ ان بچوں کے ہاتھوں میں پتھر نہیں قلم ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آگ نہیں خواب ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر شکوے نہیں دعائیں ہیں۔ ان کے ماتھے سورج کی تمازت سے نکھرے ہوئے ہیں۔ ان کی سانسیں گلابی مہک سے سرشار ہیں۔ ان کے چہرے تبسم سے روشن ہیں۔ ان کے کہے ہر ہر لفظ میں جہتوں اور جبلتوں کی گونج ہے۔ جی ہاں یہ سب بچے ایک جیسے ہیں۔ سیرت میں، صورت میں،

معصومیت میں، ان کی سوچیں ایک جیسی ہیں، ان کی کہانی ایک جیسی ہے، ان کی چاہت ایک جیسی ہے اور ۔ ۔ ۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ان کی آوازیں ایک جیسی ہیں۔ ان کے خوابوں کے جزیرے ایک جیسے ہیں اور ۔ ۔ ان کی زندگی کی ہر سچائی ایک جیسی ہے۔ تو میں ان بچوں کی یکجہتی میں ان کے اپنے پن میں ایک ساتھ جینے مرنے کے اس ہجوم میں، اس ہجوم کا ایک حصہ بن کر اپنے بچے کو کیسے تلاش کر سکوں گا؟ کیسے پہچان سکوں گا؟ اپنے بچے کو ان بچوں سے کیسے الگ دیکھ سکوں گا۔ یہ سب میرے بچے ہیں، ہمارے بچے ہیں، ہمارے جلتے بجھتے جگنو ہیں۔

آواز

صبح پھوٹتے ہی جب بوڑھا کبوتر اپنے گھونسلے سے باہر آکر مسجد کے گنبد پر بیٹھ کر اپنے پر پھڑپھڑانے لگا تو اُسے لگا جیسے رات بھر کی تپش سے پگھل کر وہ اپنے جسم سے باہر آیا ہے۔ اُس نے ذرا نیچے جھک کر چبوترے کی جانب دیکھا۔ چبوترے پر جگہ جگہ چاول اور مکئی کے ان گنت دانے بکھرے پڑے تھے اُس کی بھوک مٹانے کے لئے۔ بے ستون آسمان کی وسعتوں میں اُس جیسے بے شمار پرندوں کی بھوک مٹانے کے لئے۔ ان بے زبانوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی سے بھرا مٹکا بھی نظر آرہا تھا۔ ۔ ۔ اور اب اُسے انتظار تھا مسجد سے اُبھرنے والی پہلی آواز کا، جو قطرہ قطرہ اُس کے کانوں میں شہد گھولتی تھی اور یہ آواز اُبھرتے ہی اَن گنت قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ معمول کی طرح آواز کی گونج آج بھی اُبھری اور فضا میں بکھر گئی، لیکن اُس کی زندگی میں پہلی بار قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پریشان سا ہوا، اُڑنے کی کوشش کی لیکن پروں نے ساتھ نہ دیا۔ وہ ڈر سا گیا۔ شاید اسی ڈر کی وجہ سے اُس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں بے حسی سی آگئی تھی۔ وہ اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مسجد کا آنگن خالی خالی تھا۔ مسجد کے قریب بھی کوئی نہ تھا، لیکن مسجد سے ذرا دوری پر دس بارہ وردی پوش نظر آرہے تھے جن کے ہاتھ بندوق تھامے ہوئے تھے۔ دوسری جانب بیس تیس لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور درمیان میں مسجد کے گنبد پر وہ تھا، اکیلا،

تن تنہا، بے یار و مددگار۔ اور مسجد کی اونچائیوں سے اذان دینے والا شخص بھی اکیلا تھا۔

تن تنہا!

دفعتاً گولی چلنے کی دلخراش آواز نے شہد کو زہر میں بدل دیا اور اُسے لگا جیسے وہ ہمیشہ کے لئے بہرہ ہو چکا ہے۔ وردی پوش دو قدم آگے آئے۔ گنبد کی اونچائی سے وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہی اُسے لگا جیسے دوسری جانب سے پتھر برسانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لوگ بھی دو قدم آگے آچکے ہیں۔ پھر کچھ لمحوں کے لئے دونوں جانب بھی خاموشی چھا گئی اور اُسے لگا جیسے خاموشی لمحہ لمحہ شجر کے وجود سے باہر آکر دونوں جانب آگ لگانے میں مصروف ہے اور اِس آگ میں صبح کی روشنی سے پھوٹنے والی آواز گم ہو چکی ہے۔ چبوترے پر اپنی بھوک مٹانے کے لئے کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ عجیب سا وحشت زدہ ماحول تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو جنبش دی اور اُسے لگا جیسے ایک وردی پوش اپنے دوسرے ساتھیوں کو کچھ بتا رہا ہے، سمجھا رہا ہے، ہدایت دے رہا ہے اور پھر ایک وردی پوش آگے آیا اور مسجد کی جانب جانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے مسجد سے ایک شخص باہر آیا۔ کبوتر اُس کو پہچان گیا۔ وہ اُس کی پُرسوز اور مٹھاس بھری آواز سے واقف تھا۔ بندوق کی نوک پر وہ چلتا رہا اور دوسرے ہی لمحے ایک جیپ اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ جیپ کے بینٹ پر بٹھا کر اُسے رسیوں سے کچھ اس طرح باندھا گیا کہ اُس کے لئے اپنا ہی جسم ہلانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی بے بس نظر آرہا تھا ۔ ۔ ۔ خوف زدہ ۔ ۔ ۔ صبح کی روشنی میں پھوٹنے والی اُس کی آواز جیسے بے آواز ہو چکی تھی۔ جیپ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور اسی رفتار سے سارے وردی پوش بھی!

''اب کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ '' کبوتر گھبرا گیا اور اُسے بے تحاشا پیاس کا احساس ہوا۔ جیپ

آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی ۔ ۔ پھر لوگوں کے قریب سے بالکل سامنے سے گزرنے لگی۔ لوگوں نے اُسے جانے دیا۔ سب کو جانے دیا۔ کہیں سے کوئی پتھر نہ چلا، کوئی آواز سنائی نہ دی۔ یہ ماجرا دیکھ کر کبوتر حیران ہوا، بے حد حیران ہوا ۔ ! اُس کے ذہن میں ایک سوال اُبھرا۔ اپنے ہی سوال کی تہہ میں جھانکتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ ایک معصوم کو ہیومن شیلڈ کر روپ دینا بزدلی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے ۔ ۔ ؟

کبوتر اپنی چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں سے دیکھتا رہا، لوگ بھی دیکھتے رہے۔ سب کچھ اُن کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا لیکن وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سارے لوگ خاموش رہے، پُرسکون رہے، اپنی اُس آواز کو زندہ رکھنے کے لئے، اُس کی حفاظت اور بقا کے لئے، جو ہر روز طلوعِ صبح کے ساتھ ہی جاگتی ہے اور سب کو جگاتی ہے ۔ ۔ !!

پہچان

اُن کی ملاقات بس اسٹاپ پر ہوئی تھی، لیکن پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو دیکھ کر انہیں لگا تھا جیسے وہ دونوں کتنے ہی ماہ وسال سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جیسے ان کی زندگی کے بہت سارے حالات وواقعات بہت سارے دُکھ سکھ مشترک ہیں۔ ان کی ذہنی پرورش بھی جیسے ایک ساتھ اور ایک جیسے ماحول میں ہوئی ہے۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ان کی زندگی میں ایک تضاد بھی تھا۔ ایک ایسی سوچ جو مشترک نہ تھی۔ مرد رات کے اندھیرے سے نفرت کرتا تھا۔ اُسے دن کی روشنی اچھی لگتی تھی، ہنستی مسکراتی روشنی۔ وہ چاہتا تھا کہ دن کی روشنی میں عورت خوشبو بن کر اس کے وجود میں سمٹ جائے۔ لیکن عورت کو رات کے اندھیرے پسند تھے۔ وہ دن کی روشنی کو اپنی زندگی میں بہت کم اہمیت دیتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ دن کی روشنی میں وہ لطافت کہاں، وہ دل نشینی کہاں، خاموش لمحوں کی وہ تنہائی کہاں، جو رات کے اندھیروں میں ہے۔ رات کے اندھیاروں میں ایک دوسرے کو دیکھا نہیں جاسکتا، صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور دائمی محبت کے لئے احساس کو ہونا بہت ضروری ہے، بہت اہم ہے۔ اس احساس کے بغیر محبت مکمل نہیں ہوسکتی۔ عورت چاہتی تھی کہ اُس کا چاہنے والا رات کے اندھیاروں میں اس کے ساتھ رہے تاکہ وہ خوشبو بن کر ذرّہ ذرّہ بکھر جائے۔ مرد نے عورت کی چاہت دن کی روشنی میں بدلنے کی کہانی لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس نے عورت کی چاہت کا ساتھ دینے کے لئے

اندھیاروں میں ہم سفر بننے کی بڑی کوشش کی۔ اسے یہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ عورت اپنی بات پر بضد رہی۔ سیاہ رات کے اندھیرے اس کی زندگی اور اس کی انا کا ایک حصہ بن چکے تھے۔

اور پھر ایک رات اپنی سوچ کے دروازے کو مقفل کر کے وہ مرد اندھیاروں میں عورت سے ملنے چلا گیا۔ دن کی روشنی کو رات کے اندھیروں میں گم کرنے کے لئے۔ اس کے سامنے سرخم کرنے کے لئے یا شاید اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے، ایک اَن دیکھی لذت سے آشنا ہونے کے لئے ۔ ۔ باغ بہار کا ایک گمنام اور خاموش گوشہ ۔ ۔ مرد کو یقین تھا کہ رات کے اندھیرے میں باغ بہار کے اسی خاموش گوشے میں وہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اور پھر اپنی محبوبہ کی سانسوں کو اپنی سانسوں میں سمیٹنے سے پہلے ہی اسے ایک بڑا سا جھٹکا لگا۔ وہ کسی غیر مرد کے آغوش میں سمٹ سمٹ کر پوشیدہ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دونوں صاف صاف دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن ان کے حرکات وسکنات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا تھا اور پھر ذرا دیر بعد اس کے کانوں سے عورت کی آواز ٹکرائی ۔ ۔ یہ اندھیرے مجھے اس لئے پسند ہیں کہ ان اندھیاروں میں، میں اپنے محبوب سے بغلگیر ہوسکتی ہوں ۔ ۔ اپنے دل کی دھڑکنیں سنا سکتی ہوں اور ۔ ۔ اور لپٹ لپٹ کر اپنی محبت کا اظہار کر سکتی ہوں۔ ان اندھیروں میں مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ ہر بار میں نئی پہچان کے ساتھ ان اندھیاروں میں گم ہو جاتی ہوں، کھو جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ اور چاہتی ہوں کہ صبح کبھی نہ آئے، روشنی کبھی نہ ہو ۔ ۔

اور وہ ۔ ۔ روشنی کا متلاشی مرد اپنی محبوبہ کی نئی ۔ ۔ شاید نئی نہیں اصل پہچان دیکھ کر تشنگی کا احساس لئے لوٹ آیا ۔ ۔

کتابیں

افسانوی ادب کے تعلق سے پینل ڈسکشن میں جب عرفان عرفی کے افسانوں کی بات چلی تو اُس کے ہم عصر افسانہ نگار ایوب اجنبی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا ۔ ۔ ۔

''وہ تو اپنے افسانوں میں سیکس کی باتیں کرتے ہیں، سیکس کو ترجیح دیتے ہیں اور سیکس کے ہر زاویے اور ہر انداز کو بڑی وضاحت اور کھلے پن سے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں یہاں تک کہ شبستان کے دبیز پردوں کو سرکا کر منظر عام پر لاتے ہیں۔ اس لئے میں نے اُن کی اب تک کی شائع شدہ کتابیں اپنی لائبریری کی ایک تالہ بند الماری میں چھپا رکھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں میرے بچوں کی نظروں سے دور رہتی ہیں۔ وہ شاید ان کتابوں کے وجود سے بھی ناواقف ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے اور شاید حیران کن بھی کہ میری اس تالہ بند الماری میں منٹو سے لے کر عرفان عرفی تک کی تحریر کردہ قریب قریب ساری شائع شدہ کتابیں موجود ہیں''

''لیکن سیکس بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے ۔ ۔ ایک اہم حصہ ۔ ۔ ایک اہم ضرورت بلکہ زندگی کی سچائی ہے''

''ہاں ضرور ہے۔ مجھے اعتراف ہے اس بات کا۔ لیکن آپ کے لئے میرے لئے۔ میرے یا آپ کے بچوں کے لئے نہیں۔ وہ معصوم ہیں، ناسمجھ ہیں ۔ ۔ کم عمر ہیں۔ ویسے بھی میری ذاتی لائبریری میں ان گنت کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کو میرے بچے ضرور پڑھ سکتے ہیں اور اکثر پڑھ بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کتابوں میں سیکس نہیں، عریانیت نہیں بلکہ خود

اعتمادی کا عنصر ہے۔ انسانی تقدس کی عکاسی اور انسانی کردار کی بلندی ہے۔ یہ کتابیں یہ تخلیقات مقصدیت اور انسانی ذہن کے ابدی حُسن کی پاکیزگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ میری ان کتابوں میں علم ہے اور ادب بھی۔ میں خود بھی اصلاحی اور پاکیزہ نوعیت کی کتابیں پڑھنے میں یقین رکھتا ہوں اور بچوں کو بھی اس نوعیت کی کتابیں پڑھنے کی تلقین کرتا ہوں''

بات آئی اور ختم ہوگئی۔

کوئی چار ماہ بعد مجھے منٹو کی ایک کتاب کی ضرورت پڑی اور میں یہ سوچ کر کہ یہ کتاب ایوب اجنبی کی تالہ بند الماری میں ضرور محفوظ ہوگی، میں اُن سے ملنے چلا گیا۔ اُن کے دو بچے ہیں۔۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور بیٹا انجینئرنگ کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ بیوی سرکاری ملازمہ ہے، اس لئے وہ گھر میں اکیلے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بھرپور مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔

''کمال ہے صاحب۔۔ منٹو کے ساتھ عرفان عرفی کو بھی لیتے جایئے''

وہ مجھے اپنی لائبریری میں لے گئے۔ احتیاط سے الماری کا تالا کھولا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ الماری قریب قریب خالی تھی۔ الماری میں دستیاب دو چار کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ میری ضرورت کی کتاب موجود نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان بلکہ بہت پریشان ہوئے اور کچھ کہے بغیر ہی اپنی خواب گاہ میں گئے۔ کچھ دیر بعد وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

''میں کسی اور دن آوں گا۔ اگر کتاب مل جائے تو مجھے فون سے اطلاع دیجئے گا''

انہوں نے مجھے روکے رکھا۔ اپنے اور میرے لئے چائے بنائی۔ وہ چائے پی رہے تھے اور مجھ سے باتیں بھی کر رہے تھے لیکن اُن کے چہرے کی تھکن میں پوشیدہ تاثرات اُن کی بے قراری، بے چینی، پریشانی اور بے اطمینانی کی عکاسی کر رہے تھے۔۔ اور پھر وہ کچھ سوچ

کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے اور دوسرے ہی لمحے اپنے دونوں ہاتھوں میں بہت سی کتابیں تھامے میرے قریب آئے اور خاموشی سے ساری کتابیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں کتابوں کو دیکھتا رہا۔ اُلٹ پلٹ کرتا رہا اور وہ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پیالی میں پڑی ٹھنڈی چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔ مجھے میری ضرورت کی کتاب مل گئی اور میں کچھ کہے بغیر ہی جان گیا کہ یہ ساری کتابیں ۔ ۔ ۔ منٹو سے لے کر عرفان عرفی تک ایوب اجنبی صاحب کی بیٹی نے اپنے بیڈروم میں چھپا کر رکھی تھیں ۔ ۔ ۔ !!

خنجر چلا دیا کہ مرہم لگا دیا

یہاں آنے سے قبل وہ ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ غیر اور اجنبی تھے۔ حالانکہ دونوں سرکاری ملازم تھے اور اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ اُن کا سروس کیڈر بھی ایک جیسا تھا لیکن پوسٹنگ الگ الگ جگہوں پر تھی۔ اُن کی پوسٹنگ اب بھی الگ الگ جگہوں پر ہی تھی لیکن رہائشی کوارٹر ساتھ ساتھ ملنے کے بعد اُن کی اجنبیت دور ہو چکی تھی۔ دونوں کے رہائشی کوارٹر ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے تھے، اس لئے اب اُن کے ملنے جلنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ چونکہ اُن دونوں کا زیادہ وقت دفتر کی نذر ہوتا تھا اس لئے اُن کی اکثر ملاقاتیں ہیلو ہیلو تک ہی محدود رہتی تھیں۔ لیکن چھٹی کے روز اور خاص طور سے اتوار کو وہ ایک دوسرے کے ہاں ملنے چلے آتے۔ کبھی اصغر میاں امجد میاں کے ہاں چلے جاتے اور کبھی امجد میاں اصغر میاں کے ہاں چلے آتے۔ فرصت کے لمحوں میں اُن کی خوب گپ شب ہوتی۔ سرکار اور سرکاری باتیں، کورپشن اور کرپٹ آفیسروں کی باتیں، معاشی ناہمواریاں، سماجی پیچیدگیاں اور انسانی قدروں کی پامالی بھی اُن کی گفتگو کا حصہ ہوتیں اور کبھی کبھار اُن کی باتیں سیکس سے شروع ہو کر کسی کی زلفیں کسی کے کاندھے پر دراز ہونے کی باتوں پر ختم ہو جاتیں ۔ ۔ ۔ اور اس طرح وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ اُن کی دوریاں اس قدر نزدیکیوں میں بدل چکی تھیں کہ اب اُن کی بیویوں اور

بچوں کو ایک دوسرے کے ہاں وقت بے وقت آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بچے اسکول جانے کی وجہ سے وہ دونوں اکیلی رہ جاتیں اور اکیلے پن کو دور کرنے کے لئے وہ دونوں ۔ ۔ ۔ مسز اصغر اور مسز امجد آپس میں اس قدر گھل مل گئی تھیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے وہ ایک دوسرے سے ناواقف تھیں۔ مسز اصغر مسز امجد کے ہاں ہر دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی نئی چیز دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ کبھی فرج بدلا جا رہا ہے اور کبھی نیا اور قیمتی ٹی وی سیٹ گھر کے اندر لایا جا رہا ہے۔ فرش کو ایرانی قالیوں سے سجایا جا رہا ہے۔ روز روز نئے کپڑے، نئی ساڑھیاں، نئے جوتے جوتیاں دیکھ کر مسز اصغر کا دل اُچھل اُچھل سا جاتا۔ اس کے ذہن میں تمناؤں کے دیپ جلنے لگتے۔ دل میں آرزوؤں کی نئی قندیلیں جگمگانے لگتیں۔ اس نے کئی بار اپنے میاں سے اپنے دل کی بات کہنا چاہی۔ پر وہ جانتی تھی کہ اس کا میاں نہ صرف اپنی پوری تنخواہ اس کے سپرد کرتا ہے بلکہ اُس کی ضرورت کی چیزیں بھی وہ خود ہی خرید کر لاتی ہے۔ اب تو مسز اصغر مسز امجد کے ساتھ مارکیٹ بھی جاتی تھی۔ اس کی موجودگی میں نت نئی چیزیں خریدتی تھی۔ اب تو اس نے اپنی خریداری کا رُخ سونے کے زیورات کی جانب موڑ دیا تھا۔ نت نئے ڈیزائن کے زیورات خریدتے وقت مسز امجد مسز اصغر کی رائے اور پسند کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی مرضی سے ہی خریداری کرتی تھی۔ اب تو مسز امجد مسز اصغر اور اس کے بچوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ خرید لیتی تھی۔ مسز اصغر کے لئے زیبائش کا سامان اور بچوں کے لئے کھیل کھلونے بسکٹ، چاکلیٹ ۔ ۔ مسز امجد کا یہ پیار اور لگاؤ دیکھ کر مسز اصغر خاموشی سے قبول کر لیتیں۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی کبھی کبھار مسز امجد اور اُس کے بچوں کے لئے کچھ خریدے، لیکن یہ سوچ کر خاموش رہتی کہ ایسا کرکے اُس کے گھر کا بجٹ اُلٹ پلٹ کر رہ جائے گا۔ مسز اصغر نے کئی بار

اپنے میاں سے اس تعلق سے بات چھیڑنا چاہی، بلکہ ایک آدھ بار چھیڑ بھی دی لیکن اس کی خاموشی دیکھ کر اُسے بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے میاں کو ہر اُس چیز یا ہر اُس بات سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا تعلق اُن کی ذاتی زندگیوں سے نہ ہو اور دوسروں کی بات سننا یا سنانا انہیں پسند نہیں۔

اسی دوران سرکاری سطح پر انتخابات عمل میں لائے گئے۔ نئی سرکار بنی۔ نئی سرکار نے عوامی بھلائی اور بہبودی کے لئے کچھ نئے اقدام اُٹھائے۔ کورپٹ آفیسروں کی ایک فہرست مرتب کی گئی اور عملی کاروائی کا آغاز ہوا۔

اور ایک دن مسز اصغر گھر میں بالکل تنہا تھی۔ کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ میاں دفتر اور بچے اسکول چلے گئے تھے۔ مسز امجد نے اس کے گھر میں قدم رکھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت سا ڈبہ بھی تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' ۔ ۔ مسز اصغر نے جاننا چاہا۔

''یہ ایک ڈبہ ہے۔ بہت ہی قیمتی ہے یہ ڈبہ''

''کیا مطلب''

''سونے کے زیورات سے بھرا پڑا ہے یہ ڈبہ ۔ ۔ ۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو ۔ ۔ لیکن بہت حفاظت سے''

''میں اپنے پاس رکھوں گی ۔ ۔ لیکن کیوں؟''

''جس بینک میں ہمارا لاکر تھا وہاں مرمت ہو رہی ہے۔ اس لئے لاکر خالی کرنا پڑا۔ تم یہ ۔ ۔''

''تم تو اپنے گھر میں بھی رکھ سکتی ہو ۔ ۔''

''ہاں رکھ سکتی ہوں، لیکن تم جانتی ہو، میں کس قدر لاپرواہ ہوں۔ میری لاپرواہی سے ہمارا نقصان ۔ ۔ !''

''ہاں لاپرواہ تو تم ہو ہی ۔ ۔ '' مسز اصغر نے خود ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نیا لاکر ملتے ہی تم سے لے لوں گی، بس چند دنوں کی ہی تو بات ہے''

مسز اصغر انکار نہ کر سکی۔ اُس نے زیورات سے بھرے ڈبے کو اپنی الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اس نے اپنے میاں سے بھی یہ سوچ کر بات نہ کی کہ چند دنوں کی ہی تو بات ہے!

چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ اُن کا آنا جانا جاری رہا۔ محبتیں بڑھتی رہیں۔

اور ایک شام امجد میاں کے ہاں چھاپہ پڑا۔ اُس کا نام بھی کرپٹ آفیسروں کی فہرست میں آچکا تھا۔ بینک کا لاکر خالی پا کر گھر کی تلاشی شروع ہوئی لیکن وہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ لیکن کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ جانے کیسے پولیس ٹیم کی سربراہی کرنے والے مجسٹریٹ کے ذہن میں بھی ایک چراغ جل اُٹھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں، اُس نے دوسرے کواٹروں میں بھی تلاشی لینے کے احکامات صادر کیے۔

اصغر میاں جیسے ایمان دار، مخلص اور پرہیزگار آفیسر کے گھر سے لاکھوں روپے کی مالیت کے زیورات پا کر پوری ٹیم ششن و پنج میں پڑ گئی۔ قانونی کاروائی کرتے ہوئے اصغر میاں کو اپنی آمدن سے زیادہ اثاثہ رکھنے کے جرم میں حراست میں لیا گیا ۔ ۔ !!

مسز امجد سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہی ۔ ۔ !!

کڑوا سچ

ہر صبح ہر اخبار میں مختلف نوعیت کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں، لیکن میں جن خبروں کی جانب اشارہ کر رہا ہوں اُن کے تعلق سے میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں ہوتی، کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ خبروں کے پس منظر میں ہر کہانی من گھڑت ہوتی ہے اور تو اور ٹی وی چینل پر دکھائی جانے والی تصویروں میں بھی کمپیوٹر کی کرشمہ سازیوں کا دخل ہوتا ہے۔ پر میں کیا کروں، ایسی خبریں پڑھ کر اور ایسی تصویریں دیکھ کر میری سوچین اکثر مجھے لکھنے پر اُکساتی ہیں۔ ان خبروں کو کہانیوں کا روپ دینے پر مجبور کرتی ہیں تا کہ آنے والے دنوں میں اخباری خبروں پر مبنی یہ کہانیاں ہماری تاریخ کے اوراق کا ایک حصہ بن سکیں۔ ان کہانیوں کو اپنے انداز سے ضبط تحریر میں لاتے ہوئے میرا قلم ہمیشہ لہو کے رنگ میں رنگنے لگتا ہے اور مجھے ہر منظر لہولہو سا لگتا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپکا ہوا ایک ایک آنسو ایک ایک لفظ بن کر دشت کے دامن میں بکھر بکھر جاتا ہے۔ میری یہ کہانیاں جو غم کی سوغات سے بھری پڑی ہیں اور کبھی کبھی مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ میری اپنی زندگی سچائی کے صلیب پر لٹکی ہوئی ہے اور میرے دائیں بائیں میرے آس پاس کالا دھواں پھیل گیا ہے اور آسمان کی وسعتوں میں اُڑتے ہوئے پرندے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے ہیں۔ میں چیخنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں لیکن زبان ہونٹوں کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔

چلئے، آج میں ان اخباری خبروں میں پوشیدہ چند کہانیاں آپ کو سنانے کی جسارت کررہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

پہلی خبر/پہلی کہانی

یہ خبر ہائے وے سے تعلق رکھتی ہے جہاں ٹیوشن سینٹر کی بھرمار ہے۔ صبح سے شام گئے تک یہاں لڑکے لڑکیوں کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ لیکن اس لڑکی کی بدقسمتی کا اندازہ لگایئے کہ ٹیوشن سینٹر کے گیٹ سے باہر آتے ہی موٹر بائیک پر سوار ایک لڑکا اس کے قریب آکر رُک گیا اور لڑکی سے کچھ کہنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے تیزاب سے بھری بوتل اس کے چہرے پر انڈیل دی۔ یہ لڑکی اپنے آپ کو بچانے کے باوجود بچا نہ سکی، اور وہ بے نام لڑکا اپنی موٹر بائیک کی تیز رفتاری کے سبب بھاگنے میں کامیاب رہا۔ راگیروں کی مدد سے اس بے نام لڑکی کو اسپتال لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ سارا چہرہ جھلس گیا ہے اور اس کی آنکھوں کی بینائی بھی متاثر ہوئی ہے۔ پولیس آئی اور مجرم کو تلاش کرنے میں جٹ گئی۔ اور میں سوچ رہا ہوں اگر مجرم مل بھی گیا تو کیا اُس بے نام لڑکی کو اس کا چہرہ مل جائے گا؟ اس کی خوبصورتی لوٹ آئے گی؟ اس کی آنکھوں میں پوشیدہ خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگے گی؟ شہر میں یہ افواہ گشت کررہی ہے کہ اس لڑکی نے اس لڑکے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ۔ ۔ مائی گاڈ ۔ ۔ اتنی بڑی سزا۔

دوسری خبر/دوسری کہانی

آج اخبار پڑھتے پڑھتے میرا وجود چھلنی چھلنی ہوگیا۔ خبر ہی کچھ ایسی تھی۔ کل رات ایک بار پھر نا اُمیدی اور مایوسی کے زہریلے ناک نے میرے شہر کی ایک بے نام کلی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ڈس لیا، اور دو کلیوں کو پھول بننے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دیا۔ ان دو کلیوں کا تعلق

ایک پس ماندہ اور مفلس گھرانے سے تھا۔ دونوں کلیوں کو ان کے اپنے ہی ادھ کچے مکان میں اَن دیکھے لوگوں نے اپنی ہوس کی راکھ بنا کر کثافت کے ڈھیر میں بدل کر رکھ دیا۔ پولیس آنے سے پہلے ہی وہ ادھ کچا مکان جل کر راکھ ہو گیا۔ دونوں کلیوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ اُن کا غریب باپ ایک گوشت فروخت کی دوکان میں کام کرتا تھا جس کے بارے میں یہ افواہ پھیلائی گئی تھی کہ وہاں ''بڑا گوشت'' بھی فروخت ہوتا ہے۔

تیسری خبر/تیسری کہانی

خبر یہ ہے کہ دفتر سے گھر آتے وقت ایک شادی شدہ خاتون کو چند نا معلوم افراد نے زبردستی اپنی بے نمبر کی کار میں دھکیل کر اغوا کیا، اور کسی انجانی اور سنسان جگہ پر لے جا کر اس کا گینگ ریپ کیا گیا اور رات گئے اسے بے حسی کی حالت میں سرِ راہ چھوڑا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ گھر جانے کے بجائے نزدیکی پولیس اسٹیشن گئی اور تین نا معلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کی استدعا اس بنیاد پر کی کہ وہ ملزموں کو پہچان سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس آفیسر خاتون نے ایک غیر قانونی کام کرنے سے انکار کیا تھا۔

چوتھی خبر/چوتھی کہانی

یہ خبر اپنے ہی شہر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ خبر تو کل شام ہی کے کسی اخبار کے ایوننگ ایڈیشن میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے اس خبر کی جانکاری آج صبح کے اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے ملی۔ ہوا یوں کہ اسکول میں کام کرنے والے ایک چپراسی نے اسکول میں پڑھنے والی ایک نابالغ لڑکی کی آبروریزی کی اور موقعۂ واردات سے فرار ہو گیا۔ پولیس اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہی ہے کہ بڑے اسکول میں بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں ایسا کیوں اور کیوں کر ممکن ہو سکا۔

میرے پاس اور بھی بہت ساری خبریں ہیں، بہت ساری تصویریں ہیں جنہیں میں کہانیوں کا روپ دے سکتا ہوں، تصویروں میں قید کرسکتا ہوں۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ یہ سب خبریں، یہ سب تصویریں من گھڑت حالات وواقعات پر مبنی ہیں۔ ان میں کوئی صداقت کوئی سچائی نہیں ہے۔ مجھے ذرا یہ بتانے کی زحمت گوارا کیجئے کہ آپ بھی کیا ان خبروں کی صداقت اور سچائی پر یقین رکھتے ہیں؟ اگر رکھتے ہوں تو آپ سے میرا صرف ایک سوال ہے۔ مجھے بتایئے کہ ''بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ'' کے اس دور میں بھی ایسی خبریں یا ایسی کہانیاں سچی ہوسکتی ہیں؟

☆ ☆

آنے والے کل کا ماجرا

ڈاکٹر کی بات سن کر حامد کو لگا جیسے اس کی زندگی کی شاخ سے دُھواں سا اُٹھنے لگا ہے اور اس دھوئیں میں سب کچھ دُھندلا سا گیا ہے اور سارے نقوش گم ہو گئے ہیں۔

''حامد۔۔!''

''جی کہیے ڈاکٹر صاحب''

''اب ان کا بچنا مشکل ہے۔ شراب نے ان کا انگ انگ نیم مردہ بنا دیا ہے۔ دل جگر ہی کیا اب تو تمہارے والد ذہنی طور پر مفلوج ہوتے جا رہے ہیں۔ اب دوا کی نہیں، دُعا کی ضرورت ہے''

اچانک حامد کے باپ نے اپنی آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی حرکت ہوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

''پاپا۔۔ کیا چاہیے؟''

پاپا خاموش نظروں سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھتے رہے۔

''بتایئے نا پاپا۔۔ آپ خاموش کیوں ہیں؟''

''حامد! یہ کچھ نہ بتا پائیں گے۔۔ ہاں، میں جانتا ہوں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں''

''کیا۔۔؟ آپ ہی بتایئے نا ڈاکٹر صاحب''

''زہر۔۔ انہیں شراب کی طلب ہے''

''شراب۔۔؟''

''ہاں حامد۔۔ ان کا خیال رکھنا، میں اب چلتا ہوں''

''آپ پھر دیکھنے آئیں گے نا''

''شاید اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ حامد حوصلہ رکھو۔ اپنی ماں کو سنبھالو اور اپنی بہن کا خیال رکھو''

اور اُسی رات حامد کے باپ نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اور حامد کی آرزوؤں اور تمناؤں کی خوش رنگ تتلیاں اُڑتے اُڑتے اس کی زندگی کی شاخ سے اُٹھنے والے دھوئیں میں پوشیدہ ہوگئیں۔ اس نے اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

گھر تو تھا رہنے کے لئے لیکن گھر میں جو کچھ ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں تھا۔ گھر خالی خالی سا تھا۔ بوڑھی ماں تھی جو اکثر بیمار رہتی تھی۔ بہن تھی جوانی کی دہلیز پر کھڑی، اپنے ان دیکھے شہزادے کی منتظر۔

ایک وہ خود تھا، پڑھا لکھا لیکن بے کار، بے روزگار۔ اب وہ اپنے گھر کو گھر کی صورت دینے کے لئے، اپنی ماں کے علاج و معالجہ کے لئے اور اپنی بہن کو اُس کے خوابوں کے شہزادے سے ملانے کے لئے گھر گھر اور دفتر دفتر دروازہ کھٹکھٹانے لگا، لیکن روزگار کے سارے دروازے جیسے اُس کے لئے بند ہو چکے تھے۔

لیکن ایک رات جانے کیسے ایک خوش رنگ تتلی اس کے ذہن کے باغیچے میں اُڑنے لگی۔ وہ اچانک گہری نیند سے جاگ اُٹھا اور دوسری صبح اُس ہوٹل مالک سے ملنے گیا جہاں اُس کا باپ روز شراب پینے آتا تھا اور اپنی کمائی کا بڑا حصہ گلاسوں میں انڈیل دیتا تھا۔

''میں یہاں ویٹر کی جگہ دے سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے بار میں کام کر سکتے ہو۔ کام مشکل نہیں۔ خاموشی سے کچھ کہے بغیر لیکن محبت کے ساتھ، نزاکت کے ساتھ، ہنستے ہوئے پینے والوں کی پیاس بجھانی ہے۔ گھبراؤ نہیں، میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔ ویسے تھوڑا سا تجربہ تو تمہیں ۔ ۔ ۔'' اپنی بات خود ہی کاٹتے ہوئے ہوٹل مالک خاموشی سے حامد کی جانب دیکھنے لگا۔

جانے کیا سوچتے ہوئے حامد نے حامی بھرلی اور دوسرے دن سے ہی کام پر آنا شروع کر دیا۔ ماں اور بہن خوش تھیں کہ حامد کو روزگار مل گیا۔ کچھ کمائے گا تو گھر کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ حامد کہاں کام کر رہا ہے اور اس کا کام کس نوعیت کا ہے۔

چند ہی روز میں حامد ہوٹل کے ماحول میں گھل مل گیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ گاہکوں کے گلاسوں میں شراب انڈیلتے ہوئے وہ آہستہ سے کہتا ۔ ۔ ۔

''شراب مضر صحت ہے۔ شراب اندر ہی اندر خاموشی سے انگ انگ کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ جانے آپ کی کتنی ذمہ داریاں ہوں گی۔ صحت نہ رہی تو ان ذمہ داریوں کو کون نبھائے گا''

اکثر پینے والے حامد کی باتیں سن کر مسکرا دیتے اور کہتے ۔ ۔

''ایک اور لارج تمہاری صحت مند سوچوں کے نام''

اور جب یہ بات ہوٹل کے مالک کے کانوں میں گونجی تو وہ بے حد ناراض ہوا۔ یہ تو ایک طرح اُس کے خلاف سازش تھی، اُس کے بزنس کو تباہ کرنے کی سازش۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ کچھ لوگوں نے واقعی بار میں آنا بند کر دیا تھا۔ اُس نے حامد کی حرکات و سکنات کا جائزہ

لینا شروع کیا اور جب وہ مطمئن ہوا تو غصے میں آ کر حامد کو نوکری سے الگ کر دیا۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ حامد تلاش روزگار میں بھٹک بھٹک کر تھک گیا۔ تھک کر اپنی سوچوں میں ریت کی تصویریں بنانے لگا اور پھر خود ہی ان کو مٹاتا رہا۔ اس دوران حامد کی ماں مر گئی۔ اس کی بہن ٹوٹ گئی اور اپنی عمر سے پندرہ برس بڑے ایک سرمایہ دار سے شادی کر لی۔ وہ تنہا رہ گیا ۔ ۔ بالکل تنہا۔ لیکن اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ اپنے اندر کے دشمن کو اپنا دوست بنا لیا۔ اب وہ ہر شام شراب خانے کے گیٹ کے باہر نظر آنے لگا تھا۔ بار کے اندر جانے اور باہر آنے والوں کو ایک ہی آواز سنائی دیتی تھی ۔ ۔

''آپ اپنی آگ میں نئی نسل کو جلانا کیوں چاہتے ہیں ۔ ۔ !!''

کہنے کی بات

''میں آپ کی خاموشی دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں'' ۔ ۔ میری بیوی مجھ سے کہنے لگی

''تو کیا کروں'' ۔ ۔ میں نے جواب میں کہا

''جانتی ہوں کہ اب آپ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ گھر گرہستی کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، لیکن گھر میں بڑے تو آپ ہی ہیں اور اس ناطے آپ اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کیوں کر رہے ہیں''

''اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کروں'' ۔ ۔ میں نے پھر اپنی بات دہرائی

''جمیل آپ کا پوتا ہے۔ آپ کے بیٹے کا بیٹا''

''یہ بات تو میں بخوبی جانتا ہوں۔ تم مجھے یاد کیوں دلا رہی ہو''

''پھر اپنے جمیل سے پوچھتے کیوں نہیں؟''

''کیا پوچھوں؟''

''اس قدر لاپرواہی سے ڈرائیونگ کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ نئی کار کو دیوار کے ساتھ ٹکرا کر اُس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا''

''میرے پوچھنے سے کیا ہوگا؟ میں جانتا ہوں کہ اُس کا جواب کیا ہوگا''

''پوچھے بغیر ہی آپ جانتے ہیں کہ اُس کا جواب کیا ہوگا''

”ہاں۔ شاید تم بھول رہی ہو کہ جب وہ چھ سات سال کا تھا، تب اُس کا باپ اُس کے لئے ایک اچھا سا خوبصورت سا کھلونا خرید کر لایا تھا۔ کھلونے کی شکل میں وہ ایک سندر سی چھوٹی چھوٹی کار تھی جو چابی کے سہارے گھومتی پھرتی تھی۔ اور ایک دن وہ کار جمیل کی لاپرواہی سے ٹوٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بے کار ہوگئی، اور جب میں نے اُس کے لاپرواہی کے لئے اُسے ڈانٹنا چاہا، کچھ کہنا چاہا۔ یاد ہے اُس نے جواب میں کیا کہا تھا۔۔ ؟“

”مجھے یاد نہیں۔ کیا کہا تھا؟“

”کہا تھا کہ یہ کھلونا میں نہیں بلکہ اُس کے پاپا اُس کے لئے خرید کر لائے تھے اور ڈانٹ آپ رہے ہیں“

”تو پھر؟“

”سوچتا ہوں اگر اب کی بار بھی اُس کا جواب مختلف نہ ہوا تو۔۔۔!“

☆ ☆

واپسی

قریب قریب تیس سال قبل جب وہ بنگلور میں ایک ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور اسکول کے ہی ایک ہوسٹل میں ایک ساتھ اپنے شب وروز گزارتے تھے۔ وہ پہلی بار ایجوکیشن ٹور کے سلسلے میں کشمیر آئے تھے اور کشمیر آکر انہیں بڑی راحت کا احساس ہوا تھا۔ کشمیر ان کے لئے نئی جگہ تھی ۔ سندر سندر سی وادی، برف پوش پہاڑ، جھرنے، ندی نالے اور آبشار، رنگ برنگے پھول اور سرسبز درختوں کی بھرمار۔ آس پاس دور نزدیک دیکھ کر وہ بے حد خوشی محسوس کرتے رہے۔ نماز کا وقت ہوا جہاں چاہا جس مسجد میں چاہا، وہ ایک ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ ہمیشہ باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ لوٹ کر بنگلور آئے اور مشینی زندگی کے کاموں میں کھو گئے تو رفتہ رفتہ کشمیر اُن کے ذہنوں سے اُتر گیا۔ پھر وہ اسکول سے کالج کی زندگی میں آئے۔ اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان میں سے ایک ڈاکٹر بنا، دوسرا انجینئر اور تیسرے دوست نے اپنا بزنس سنبھال لیا۔ اب وہ تینوں بنگلور سے باہر تھے۔ کبھی کبھار ہی ملنا جلنا ہوتا، کبھی کبھار ہی اپنے دُکھ سکھ ایک دوسرے سے بانٹنے کے مواقع ملتے۔ لیکن ایک دوسرے سے دور ہو کر بھی اُن کی دوستی قائم و دائم رہی۔

اور پھر ایک دن اپنی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کے لئے انہوں نے ایک بار پھر کشمیر آنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ وقتِ مقررہ پر دلی کے ایرپورٹ پر ملے اور جہاز کے ذریعے

سرینگر آ گئے۔ ایک اچھے ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے اور کشمیر کی خوبصورتی میں کھو گئے۔

ایک شام شالیمار روڈ پر ٹہل رہے تھے کہ مسجد سے آواز سنائی دی ۔ ۔ ۔ اللہ اکبر!!

''نماز کا وقت ہو رہا ہے'' ۔ ۔ ۔ غفور نے کہا۔

''ہاں'' ۔ ۔ لیاقت نے راحت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مسجد تو سامنے ہی ہے۔ زیادہ دور نہیں جانا ہے'' ۔ ۔ راحت نے حامی بھر لی۔

وہ تینوں دوست مسجد کی جانب بڑھے۔ مسجد کے اندرونی دروازے پر تینوں رُک گئے۔

لیاقت مسجد کے اندر چلا گیا۔ غفور اور راحت لوٹ آئے۔

''دوسری مسجد دیکھتے ہیں'' ۔ ۔ غفور نے کہا۔

سامنے ایک اور مسجد دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں دوست مسجد کی جانب بڑھے۔ غفور مسجد کے اندر چلا گیا اور راحت نہ جانے کیا سوچتے ہوئے وہاں سے نماز ادا کئے بغیر لوٹ آیا۔ ڈل جھیل کے کنارے ہاؤس بوٹوں کی جانب دیکھنے لگا۔ یوں تو وہ خوبصورت ماحول میں کھویا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن اندر ہی اندر جانے کس شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ وہ تیز قدموں سے سڑک پار کرنے لگا۔ ذرا سی دوری پر ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ وہ مسجد کے قریب آیا۔ مسجد کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ سرکایا اور مسجد کے اندر چلا گیا۔

وقت کے لمحے آہستہ آہستہ اُن کی سوچوں میں پگھلتے رہے۔

شام کو جب وہ اپنے ہوٹل کے لان میں کافی پینے میں مصروف تھے تو تینوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا ۔ ۔ ۔

اللہ ایک ہے، نماز ایک ہے، مسجد ایک ہے، تو پھر ہم کیوں مختلف خانوں، مختلف مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں؟ ہم نے کیوں ڈیڑھ انچ کی اپنی اپنی مسجد کھڑی کر لی ہے۔ شاید ہم بھٹک

گئے ہیں، بٹ گئے ہیں، اپنے آپ میں، اپنے وجود میں، اپنی سوچوں میں، اپنے کردار میں ۔ ۔ اسی دوران کسی مسجد سے آواز اُبھری ۔ ۔ اللہ اکبر ۔ ۔ کافی پیتے پیتے وہ کھڑے ہو گئے اور تیز تیز قدموں سے تینوں قریب کی مسجد میں ایک ساتھ داخل ہو گئے اور ایک ساتھ نماز میں شامل ہو گئے۔

شاید کشمیر میں اُن کا بچپن لوٹ آیا تھا !!

دوشکاری

"کیا سوچ رہے ہو ۔ ۔ ؟"

"سوچ رہا ہوں، رشتے اور راستے ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ کبھی کبھار رشتے نبھاتے نبھاتے راستے بدل جاتے ہیں اور کبھی کبھار زندگی کے راستوں پر چلتے چلتے رشتے بن جاتے ہیں ۔ ۔ اور ۔ ۔ !"

"اور کیا؟" اس نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں وہ کون ہے جسے نہ رشتوں کی قدر ہے اور نہ ہی راستوں کی پہچان؟"

"کون ہو سکتا ہے وہ؟"

"سوچتے سوچتے میں اُسے پہچان چکا ہوں ۔ ۔ یہ وہی ہے" میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل وہی ہے جو خوبصورت چہروں کو بدصورتی میں بدل رہا ہے، جوان خون کو سڑکوں پر بکھیر رہا ہے، محبتوں کو نفرتوں میں بدل رہا ہے، امن اور شانتی کو درہم برہم کر رہا ہے، آنکھوں کو بینائی سے محروم کر رہا ہے، لوگوں کے جذبات واحساسات کو جلا رہا ہے، پھولوں کی خوشبو کو زہر آلودہ بنا رہا ہے۔ ہاں وہی ہے۔ بالکل وہی ہے جو طلبا اور طالبات کو علم وادب، تعلیم وتہذیب کے زیور سے محروم کر رہا ہے۔ اُن کے مستقبل، اُن کے بھوش کو تاریک

سایوں میں فنا کر رہا ہے۔ اُن کو اَن پڑھ اور گنوار بنا کر اُن کی قوتِ ارادی کو کمزور کرنے کے لئے نت نئے کھیلوں کو پروان چڑھا رہا ہے۔ سخن وروں کے سخنوں کو خاموش اندھیرے میں دھکیل رہا ہے۔ قلم کاروں سے اُن کا قلم چھین کر گونگا بنا رہا ہے۔ اُن کی سوچیں سلب کرر ہا ہے"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ آخر ہے کون؟ اُس کی کوئی شکل وصورت تو ہوگی نا ۔ ۔؟"

"ہاں ہاں، وہ میری اور تمہاری طرح ایک انسان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ انسانی جسموں کو کینواس پر بنی بے جان پینٹنگ سمجھ کر سرخ سرخ لہو سے لکیریں کھینچ کر اپنی چاہت کی تکمیل کرر ہا ہے۔ لیکن وہ اکیلا نہیں ہے"

"کیا کوئی اور بھی اُس کا ساتھ دے رہا ہے؟" ۔ ۔ ایک سوال میرے سامنے رکھتے ہوئے وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

"ہاں"

"کون ہے وہ؟"

وہی جسے نہ رشتوں کی قدر ہے اور نہ ہی راستوں کی پہچان۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے۔ وہ بھی ہم میں سے ہی ہے۔ گھر کی چار دیواری میں بیٹھا رہتا ہے، لیکن جب اس کی آواز بے قابو ہو جاتی ہے اور اس کے ہونٹ حرکت میں آتے ہیں تو اس کی آواز ایک شعلہ بن کر ہر سمت آگ لگا دیتی ہے اور دیکھتے دیکھتے گلی کوچے، میدان اور پہاڑ، پیڑ پُر درد اور پُر اثر آوازوں سے لرز جاتے ہیں۔ آوازیں بلند ہوتے ہی زمین جیسے ہلنے لگتی ہے۔ آسمان کی وسعتیں دھواں دھواں ہو جاتی ہیں اور ہماری راہوں اور ہماری سڑکوں پر سرخ سرخ لہو ۔ ۔ میں اب بھی سوچ رہا ہوں"

''کیا''

''ویسے میرے دوست، میں اب سوچتے سوچتے تھک چکا ہوں''

''جانتا ہوں۔ احساس ہے مجھے تمہاری اس تھکاوٹ کا، لیکن اپنے اندر کی بات کو کب تک باہر آنے سے روک سکو گے؟''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، کب تک؟ میرے گلشن کو اُجاڑنے کے لئے وہ دونوں ذمہ دار ہیں۔ لیکن یقین ہے میرا کہ ایک نئی صبح کا آغاز ہوگا۔ ایک نئی زندگی سامنے آئے گی۔ مہک بھری فضاؤں سے بھرپور زندگی۔ میرا یہ گلشن کثافتوں سے پاک ہوگا۔ ہماری زندگی صرف ہماری زندگی ہوگی جس میں نہ وہ ہوگا اور نہ یہ۔ اُن دونوں شکاریوں کا کوئی دخل نہ ہوگا ہماری نئی زندگی میں''

''یہ پاک وشفاف، مہک بھری فضائیں ہمیں کب نصیب ہوں گی؟'' ۔ ۔ اُس نے پوچھا۔

''جب تمہیں ہم سب کو رشتوں اور راستوں کی اہمیت کا احساس ہوگا، اُن کی قدر ہوگی، اُن کی پہچان ہوگی''

اور پھر مجھے اچانک محسوس ہوا کہ ایک زبردست بھونچال آرہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ بھی نہ تھا، کوئی بھی نہ تھا۔ یہ بھونچال شاید میرے ذہن میں تھا، میرے خوابوں میں تھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ نئی صبح پھوٹ رہی تھی اور سامنے کی مسجد کے دروازے سے کسی فقیر کی آواز اُبھر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

''اِنَّ اللّٰہ مَعَ الصَّابِرِین'' ۔ ۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اپنا اپنا دُکھ

دونوں لڑکیاں طارق علی کے رشتے میں تھیں۔قریب قریب اس کی ہم عمر تھیں۔ دونوں نیک صورت اور نیک سیرت تھیں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ خود طارق علی بھی پڑھا لکھا تھا۔ ایک انٹرنیشنل کمپیوٹر کمپنی میں انجینئر کے عہدے پر تعینات تھا۔اچھی خاصی پوسٹ تھی۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ رشتہ داری کی وجہ سے وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے واقفیت تھی۔ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھالیکن شادی تو ایک ہی لڑکی سے کرسکتا تھا۔طارق علی کی مشکل یہ تھی کہ اس کی دادی کو عالیہ پسند تھی لیکن اس کی ماں کو عارفہ۔ دادی عالیہ کو اپنے خاندان کی بہو بنا کر لانا چاہتی تھی اور ماں عارفہ کو اپنے بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔اب ساس بہو کی ضد ان کی انا بن چکی تھی۔ طارق علی کے دادا اور والد کی بے پناہ کوششیں ساس بہو کی ضد کے سامنے کام نہ آسکیں۔ٹکراؤ بڑھتا گیا۔اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔گھر کا امن وسکون بگڑنے لگا۔بات اور گفتگو میں دوریاں پیدا ہونے لگیں۔ طارق علی نے اپنے والد کی وساطت سے ماں کو لبھانے کی کوشش کی۔ اپنے دادا کا سہارا لے کر اپنی دادی کی بات کو طول دینے سے روکنا چاہا۔ جب دادا اور باپ اپنی کوششوں میں آپسی بات سے حالات کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لئے اور وقت کی رفتار کو پکڑنے میں ناکام رہے تو طارق علی نے شادی کرنے

سے انکار کیا۔ اس نے انکار کے بعد خاموشی اختیار کی۔ صبح دفتر کے لئے چل پڑتا اور رات گئے کام کا بہانہ بنا کر لوٹ آتا۔ جانے کتنے شب و روز ایسے ہی گزر گئے۔ کتنی راتیں بے خواب گزر گئیں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے لمحات جانے گھر کے کس در و دیوار میں دفن ہو گئے۔ لگ رہا تھا جیسے گھر کے مکینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کبھی بھی نہ ٹھہری تھی۔ جیسے آنکھیں محبت کے نور سے بے نور ہو گئی تھیں۔ لیکن ایک دن دفتر سے آتے ہی طارق علی نے خاموشی توڑ دی ۔ ۔ ۔

"میں شادی کرنے جا رہا ہوں"

"عالیہ سے" ۔ ۔ دادی نے پوچھا۔

"عارفہ سے" ۔ ۔ ماں نے جاننا چاہا۔

"عالیہ سے اور نہ ہی عارفہ سے" طارق علی کا جواب تھا۔

"تو پھر کس کے ساتھ" ۔ ۔ ساس بہو کی آوازیں ایک ساتھ کمرے کی در و دیواروں سے ٹکرائیں۔

"میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ آپ کی بہو کو اسی گھر میں لے آؤں گا ۔ ۔ آپ ہی کے گھر میں"

ہر سمت خاموشی طاری ہو گئی۔ نہ کوئی ہونٹ ہلا اور نہ ہی کسی لب میں حرکت ہوئی۔ پلکوں کے دیپ جگمگاتے جگمگاتے بجھ سے گئے۔

اور پھر ایک دن طارق علی واقعی اپنی نئی نویلی دلہن کو گھر لے آیا۔ کلثوم کے آتے ہی دبی دبی سی خوشیاں محسوس ہونے لگیں۔ مسرتیں بکھرنے لگیں۔ طارق علی کی دادی اور طارق علی کی ماں ۔ ۔ ساس اور بہو کے چہروں سے بھی مسرتوں اور خوشیوں کے رنگ بکھرنے لگے، لیکن ان

کے اندر کی ضد، اندر کی خلش قائم ودائم رہی۔ نئی نویلی بہو نے جانے کتنے معصوم سے ارمانوں، کتنے سندر سندر سے سپنوں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں قدم رکھے تھے لیکن اس کے اَن دیکھے خواب جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔

کلثوم کی پریشانیاں اُس وقت اور بھی بڑھ جاتیں جب گھر کا کوئی کام کرتے وقت دادی کہتی ۔۔

''یہ کام رہنے دو۔ پہلے سبزی بناؤ ۔۔''

اور پھر من ہی من میں سوچتی اگر عالیہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو شاید مجھے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

''نہیں سبزی بعد میں بھی بن سکتی ہے۔ ڈھیر سارے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ ان کو واشنگ مشین میں ڈال دو ۔۔'' ۔۔ امی کہتی۔

پھر وہ من ہی من میں سوچتی۔ اگر عارفہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ سب کچھ میری مرضی سے ہوتا۔

کلثوم کبھی دادی اور کبھی ماں کی جانب حیران سی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

''میں سارے کام خود کرلوں گی ۔۔۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے''

دادا اب زیادہ وقت مسجد میں گزارنے لگے۔ باپ صبح سویرے ہی کام کے بہانے گھر سے نکل جاتے اور شام گئے تھکے تھکے سے گھر لوٹ آتے۔

طارق علی یہ سب کچھ دیکھتا رہا، محسوس کرتا رہا اور ایک دن شام گئے جب وہ دفتر سے گھر لوٹ آیا تو اس نے دادا کی موجودگی میں اپنے باپ سے کہا ۔۔۔

''پاپا میں اس شہر سے جا رہا ہوں۔ کمپنی کے ہیڈ آفس میں میرا تبادلہ ہو چکا ہے۔ مجھے فوری

طور پر ہیڈ آفس میں حاضر ہونا ہے۔ مجھے رہنے کے لئے فلیٹ بھی ملا ہے اور دفتر آنے جانے کے لئے کار بھی ۔ ۔ ''

دادا اور باپ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ دونوں مسکرا دیئے۔

اور پھر طارق نے اپنی بیوی کلثوم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ۔ ۔

''تم بھی میرے ساتھ جانے کی تیاری کرو''

اچانک اسی دوران دو معصوم سی ہم عمر لڑکیاں کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''کون ہو تم ۔ ۔ ؟'' ۔ ۔ ماں نے پوچھا۔

''کیا چاہیے تمہیں ۔ ۔ اندر کیسے آ گئیں'' ۔ ۔ دادی کے لہجے میں غصہ تھا۔

''یہ میرے کہنے سے یہاں آئی ہیں اور اب یہ اسی گھر میں رہیں گی ۔ ۔ آپ کے ساتھ''

''کیوں؟'' ۔ ۔ دادا نے جاننا چاہا۔

''کام کرنے کے لئے ۔ ۔ گھر کا کام کرنے کے لئے ۔ ۔ دادی اور امی کے لئے''

''لیکن ایک ساتھ دو دو'' باپ کے لہجے میں حیرانگی کا اظہار صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

''ہاں پاپا ۔ ۔ ایک دادی کے لئے اور دوسری امی کے لئے۔ ان کی انا کے لئے مجھے یہ کرنا ہی پڑا۔ ان کی ضد کے سامنے مجھے جھکنا ہی پڑا''

اسی کمرے کے گوشے میں ساس اور بہو ایک دوسرے کی جانب دیکھے جا رہی تھیں۔

وہ شاید سوچ رہی تھیں ۔ بیٹا بہو جائیں گے تو ان کے پاس رہے گا ہی کیا۔ بیٹے کے جانے کے زخم جوان پر ہنستے رہیں گے۔ بہو کے جانے کے داغ جو ان پر مسکراتے رہیں گے ۔ ۔ ۔ !!

لذتِ بے گناہ

''تم آگئیں ریتا''

''ہاں دیکھ تو رہے ہو''

''پر اتنی جلدی ۔ ! تمہارے لباس پر کوئی شکن بھی نظر نہیں آرہی ہے''

''تمہیں ٹھیک ہی نظر آرہا ہے''

''اور وہ فائل ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ٹینڈر فائل سے ہے''

''دستخط نہیں ہو سکے۔تمہاری فائل کے کاغذ بھی بے شکن ہی رہے''

''وہ کیوں؟''

''شکن پڑنے سے ذرا پہلے اچانک اُس کی بیوی کمرے میں نمودار ہوگئی''

☆ ☆

نورشاہ کی تخلیقات

☆	بے گھاٹ کی ناؤ	افسانے
☆	ویرانے کے پھول	افسانے
☆	ایک رات کی ملکہ	افسانے
☆	من کا آنگن اُداس اُداس	افسانے
☆	گیلے پتھروں کی مہک	افسانے
☆	بے ثمر سچ	افسانے
☆	آسمان، پھول اور لہو	افسانے
☆	کشمیر کہانی	افسانے
☆	کیسا ہے یہ جنون	افسانے
☆	پائل کے زخم	ناول
☆	نیلی جھیل کالے سائے	ناول
☆	آؤ سو جائیں	ناولٹ
☆	آدھی رات کا سورج	ناول
☆	لمحے اور زنجیریں	ناول
☆	قفس اُداس ہے	ناولٹ
☆	بند کمرے کی کھڑکی	ڈائری کے اوراق
☆	کہاں گئے یہ لوگ	ادبی خاکے
☆	جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار	تعارف، فن اور مکالمہ
☆	انتخاب اُردو ادب	۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء
☆	کشمیر نامہ (تحریر عمر مجید)	مرتب: نورشاہ، جاوید ماٹجی
☆	نورشاہ کے تین ناولٹ	مرتب: رؤف راحت
☆	نورشاہ ۔ فن اور فکشن	محمد اقبال لون

NOOR SHAH

EK MAMULI AADMI

(Short Stories)

Our Recent Publications